کنوزِ دل
شرح
رموزِ دل
امیر محمد اکرم اعوان

# کنوزِ دل

شرح

# رموزِ دل

امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

# فہرستِ مضامین


- حمد 1
- نعت 3
- رُوئے سخن 5
- ذِکر کی اقسام 9
- ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ 11
- کشف و مشاہدہ کی اقسام 16

ذِکرِ قلبی 21

- لطائف 22

مقاماتِ لطائف اور ان پہ برکات 25

- پہلا لطیفہ، قلب 26
- دوسرا لطیفہ، رُوح 30
- تیسرا لطیفہ، سری 35
- چوتھا لطیفہ، خفی 38
- پانچواں لطیفہ، اخفا 41
- چھٹا لطیفہ، نفس 51
- ساتواں لطیفہ، سلطان الاذکار 56

| | |
|---|---|
| طریقۂ ذِکر سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ | 61 |
| مراقبات | 77 |
| □ رابطہ | 78 |
| □ مراقبۂ احدیت | 82 |
| □ مراقبۂ معیت | 87 |
| □ مراقبۂ اقربیت | 92 |
| □ دوائرِ محبت | 100 |
| ○ دائرۂ محبت اوّل | 104 |
| ○ دائرۂ محبت دوم | 105 |
| ○ دائرۂ محبت سوم | 107 |
| □ مراقبۂ اسمِ ظاہر و باطن | 111 |
| □ مراقبۂ عبودیت | 116 |
| □ مراقبۂ فنافی اللہ | 121 |
| □ مراقبۂ بقاباللہ | 125 |
| □ مراقبۂ سیرِ کعبہ | 134 |
| ○ سیرِ صلوٰۃ | 136 |
| ○ سیرِ قرآن | 137 |
| □ مراقبۂ روضۂ اطہر | 139 |
| □ مراقبۂ مسجدِ نبوی | 148 |

# حمد

زمزمے تیری ثنا کے گونجتے ہیں جابجا
ذرّہ ذرّہ ، پتہ پتہ ہے تیرا مدح سرا

گُل کی صورت نے گواہی دی تیری تخلیق کی
گیت گاتی ہے تیری عظمت کے یہ تازہ ہوا

بلبلیں مدح سرا ، پپیہا پکارے ہے تجھے
نام تیرا قمریوں کا بھی وظیفہ ہو گیا

نام تیرا گونجتا ہے کوک میں کوئل کی بھی
عظمتوں کی تیری ، شاہد بن گئی کالی گھٹا

ننھے سے دِل کو چکوری کے ، عطا کر دی طلب
اور پھر چمکا دیا بادل میں چہرہ چاند کا

تیری ہیریں ، تیرے رانجھے ، تیرے صحرا ، تیرے دشت
تیری سسی ، تیرا پُنوں ، تو ہی ہے سب کا خدا

قلب تیرا ، طلب تیری ، ہم بھی ہیں تیرے فقیر
عشق کا بخشا ہے شعلہ اَب رُخِ روشن دِکھا

---

# نعت

تیری یاد ہمسفر ہے تیری یاد دِلرُبا ہے
وہ جگہ ہے میری منزل جہاں تیرا نقشِ پا ہے

تیرے نور سے ہیں روشن میری راہیں دو جہاں میں
تیرا نام بن کے سورج دِل میں چمک رہا ہے

تیرے راستوں میں ہر جا بکھرے ہوں چاند جیسے
دیکھیں نظر سے دِل کی وہ تیرا نقشِ پا ہے

مَیں اور طلب ہو تیری کہاں یہ مجال میری
دلِ زار نا سمجھ ہے ہر دم تڑپ رہا ہے

کبھی نور بانٹتا تھا تیرا قافلہ جہاں میں
مگر آج تیرا مسلم ظلمت میں گِھر گیا ہے

اسے اِک نظر عطا کر ، اسے خود سے آشنا کر
یہی ہے علاج اس کا ورنہ یہ مٹ رہا ہے

تو پیمبرِ زماں ہے ، تیرا نور جاوداں ہے
اسے کر عطا خدارا یہی اس کا آسرا ہے

دِلِ زندہ پھر عطا کر ، اسے درد آشنا کر
ملے پھر سے قافلے میں ، جس سے بچھڑ گیا ہے

تیرے نام پر فدا ہو ، تیرا درد بانٹتا ہو
بن جائے اس کی بگڑی سیمابؔ کی دُعا ہے

---

# رُوئے سخن

یہ حروف ''رموزِ دِل'' کی تحریر کی ایک حد تک وضاحت اور شرح کے طور پر سپردِ قلم ہیں۔ یہاں یہ بحث نہیں کہ تصوف ثابت ہے یا نہیں، یا یہ ضروری ہے یا نہیں، یا اس کی اساس کیا ہے؟ ان سب امور کے لیے متقدمین نے بہت لکھا ہے۔ ایک چھوٹی سی فہرست ''رموزِ دِل'' میں بھی پیش کی گئی ہے اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی منفرد تصنیف ''دلائل السلوک'' بھی اِس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ ہاں فقیر نے کوشش کی ہے کہ جو مراقبات و مقامات اور لطائف ''رموزِ دِل'' میں مذکور ہوئے ان کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔

لہٰذا یہ کتاب، مناظرین یا معاندین کے لیے نہیں بلکہ طالبین کے لیے ہے اور یہ فیصلہ وقت اور قارئین کریں گے کہ کیا انھیں اس سے کچھ راہنمائی نصیب ہو

سکی یا نہیں۔

بہر حال فقیر نے بفضل اللہ پورے خلوص سے ایک کوشش کی کہ یہ دولت بہت کم یاب ہو رہی ہے اور لوگ مادی لذات میں غرق ہو رہے ہیں۔ شاید کچھ خوش نصیب اِس دولت کا سراغ پا کر اِدھر بھی متوجہ ہوں اور اللہ کریم کی رحمت اور نبی رحمت ﷺ کی برکات سے سینہ روشن کریں۔

فقیر محمد اکرم اعوان

۲۱ جنوری ۲۰۱۰ء دارالعرفان

## بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّابَعْدُ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

بندہ نے چند سطور ''رموزِ دِل'' کے نام سے طالبین کی راہنمائی کے لیے سپردِ قلم کیں۔ مقصد یہ تھا کہ سلوک وتصوف ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور اس میں ایک لفظ اور ایک بات کی کئی تعبیرات ہوسکتی ہیں لہٰذا شیخ کے ارشادات یا توجہ اور مراقبات کی تعبیرات میں یکسوئی رہے اور ہر کوئی اپنی الگ تعبیر نہ سمجھے۔ اگرچہ اس میں کوئی خاص اِختلاف نہیں ہوتا۔ اصولی بات تو ایک ہی ہوتی ہے۔ فروعی طور پر اپنی سمجھ، علم اور اِستعداد کے مطابق کچھ فرق آسکتا ہے۔ یہ فرق بھی خطرے سے خالی نہیں کہ شیطان کچھ بھی القاء کر کے اس میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ تو اگر تعبیرات بھی سمجھ میں آجائیں تو اللہ کریم اس خطرے سے بچنے کا سبب بنا دیتا ہے۔ چنانچہ مختصراً ایک کتابچہ تحریر کردیا گیا ہے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ذکر اذکار یا سلوک وتصوف کا سرے سے انکار اور اسے ثابت کرنے پہ زورِ قلم صرف کرنا اب علم کی شان سمجھا جارہا

ہے۔حالانکہ اب سے صرف نصف صدی پہلے تک برصغیر کے علماء کے حالات پڑھیں تو ملتا ہے کہ فلاں مدرسے سے تحصیلِ علم کے بعد اتنا عرصہ فلاں بزرگ کی خدمت میں رہے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد حضرات میدانِ عمل میں قدم رکھتے تھے۔مگر آج سارا زورِ قلم ذکر اذکار کے انکار پر صرف کیا جارہا ہے اور اس کی خاطر بڑے خوب صورت جال بُنے جاتے ہیں۔ جیسے بندہ نے کل ایک مضمون دیکھا جس میں فاضل مصنف نے سارا زورِ قلم یہ ثابت کرنے پہ صرف فرمایا کہ قرآنِ کریم میں جہاں بھی ذکر کا لفظ آیا ہے اس سے قرآنِ کریم ہی مراد ہے۔اس کے علاوہ کوئی ذکر نہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔قرآنِ کریم ذکر ہے،مگر یہ کہنا بے دلیل ہوگا کہ صرف قرآن ہی ذِکر ہے۔کیا حدیث شریف ذکر نہیں ہے؟ کیا تسبیحات یا درود شریف ذکر نہیں ہے؟ کیا تبلیغ ذکر نہیں ہے؟ کیا عبادات،نماز،روزہ،حج،زکوٰۃ ذکر نہیں ہیں؟

قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ذکر کا حکم ہوا ہے کیا ہر جگہ تلاوتِ قرآن کریم مراد لی جاسکتی ہے؟ جیسے لڑائی میں حکم ہے:

فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔(الانفال:۴۵)

کہ ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو۔

تو کیا یہ ممکن ہے کہ حالتِ جنگ میں لڑائی بھی جاری رکھیں اور تلاوت بھی؟

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران:۱۹۱)

تو کیا کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہوئے تلاوت ممکن ہے؟ یا

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (الجمعۃ: ۱۰)

سورۃ جمعہ میں ہے کہ نماز کے بعد اپنے کام پہ جاؤ، مزدوری کرو، رزقِ حلال کماؤ اور اللہ کا ذکر کثرت سے جاری رکھو۔ ذکر کو اگر قرآن کریم مانا جائے تو کیا یہ عمل ممکن ہے؟

ہاں یہ درست ہے کہ قرآنِ کریم ذکر ہے، افضل ترین ذکر ہے مگر یہاں 'قرآن بھی ذکر ہے' تو درست ہے، یہ درست نہیں کہ 'قرآن ہی ذکر ہے'۔

ذکر میں اور بھی بہت سی چیزیں، حتیٰ کہ عقائد سے ایمان اور اعمال تک شامل ہیں۔

## ذِکر کی اقسام

1۔ ایمان لانا ایک عمل ہے اور اس میں اللہ کریم کی یاد موجود ہے لہٰذا ذکر ہے۔

2۔ دین کا علم حاصل کرنا بہترین اعمال میں سے ہے اور اللہ کی یاد اس میں موجود ہے لہٰذا ذکر ہے۔

3۔ (الف) ہر عمل (جو بھی ہو) خواہ فرض ہو یا واجب، سنت ہو یا مباح اس میں اللہ کریم کی یاد موجود ہے لہٰذا ذکر ہے۔ اِس میں عبادت سے لے کر امورِ دنیا تک سب شامل ہیں۔ یہ ذکرِ عملی کہلاتا ہے۔ نیز اس میں ذکر لسانی بھی شامل ہوتا ہے کہ عبادات میں تلاوت، تسبیحات ذکر لسانی ہیں۔ اسی طرح دین پڑھنا، پڑھانا، تبلیغ، سب ذکر میں شامل ہیں کہ ان میں اللہ کریم کی یاد موجود ہے۔

(ب) اگلی قسم ذکرِ لسانی ہے، تسبیحات، اوراد، درود شریف، تلاوت یہ سب ذکرِ لسانی میں شامل ہیں۔

(ج) اس سے آگے تیسری قسم ذکرِ قلبی ہے۔

قلب ایک لطیفۂ ربانی ہے جو اس گوشت کے لوتھڑے کے اندر ہے جس کے بارے ارشادِ نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو سارا بدن درست ہے اور اگر یہ خراب ہے تو سارا بدن خراب ہے۔ جان لو یہ دِل ہے۔ او کما قال ﷺ

اس (ذکرِ قلبی) کے احکام بھی موجود ہیں۔ حتیٰ کہ صاحبِ تفسیرِ مظہریؒ نے تو لکھا ہے کہ ذکرِ قلبی کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے اور احکام کے لیے صرف دو حوالے پیش کیے ہیں۔

1۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کے پاس روانہ فرماتے ہوئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ۔ (طٰہٰ:۴۲)

یعنی میرے ذکر کی طرف توجہ ثانوی نہ ہو جائے۔

نبی کا ہر ذرہ بدن نہ صرف ذاکر ہوتا ہے بلکہ ذاکر گر ہوتا ہے کہ جو چیز مَس ہو جائے ذاکر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نبی کی شان سے عدم ذکر تو ممکن نہیں ہاں فرعون ایک جابر و ظالم حکمران، کرّ و فر، لاؤ لشکر اور شان و شوکت والا دربار اور وہ اپنی خدائی کا دعویدار، اِسے دعوتِ اقرارِ توحید دینا وہ بھی بے سرو سامانی کی حالت

میں، یہ کام اللہ کا نبیؑ ہی کرسکتا ہے۔

تاکید فرمائی کہ اس حال میں بھی اول توجہ میرے ذکر کی طرف رہے اور فرعون سے کلام ثانوی درجہ میں ہو۔ یہ صورت، ذکرِ قلبی کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتی۔

2۔ دوسرا حکم خود سورۃ مزمل میں آتا ہے۔ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرما کر فرمایا:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا (المزمل:۸)

کہ اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کریں یعنی اللہ، اللہ، اللہ اِس درجہ کریں کہ ماسوا اللہ (اللہ کے سوا) کسی کی خبر نہ رہے۔ یہاں تلاوت کا حکم الگ گزر چکا تو یہ سب، ذکر اسمِ ذات اور ذکرِ قلبی ہے۔ ہاں توفیق اللہ کریم کے پاس ہے کہ سمجھنے کا شعور عطا فرمائے۔

## ایک غلط فہمی اور اس کا اَزالہ

پیشتر اس کے کہ قلب یا ذکرِ قلبی کا ذکر کیا جائے ایک غلط فہمی کا اَزالہ ضروری ہے اور وہ یہ کہ تصوف ہندو یوگیوں سے حاصل کیا گیا یا یہ یہود و نصاریٰ کی ایجاد رہبانیت سے لیا گیا اور یوں ایک ایسا ملغوبہ وجود میں آیا جس نے عقائد کو تو نقصان پہنچایا ہی، ساتھ میں لوگوں کو عمل سے بھی بیگانہ کردیا۔ یہ بات میں نے اچھے اچھے دانشوروں کی تحریروں میں بھی پائی بلکہ زوالِ اُمت کے اسباب میں تصوف کو بھی شامل کیا گیا۔ دراصل یہ تصوف کو نہ جاننے کی وجہ سے ہوا کہ ہمارے دانشور حضرات نے بغیر پڑھے اور بغیر سمجھے یہ فیصلہ دے دیا۔

اسلام میں تصوف کیا ہے؟ یہ سمجھنا ضروری ہے۔ تصوف میرے نزدیک لفظ تزکیہ کا ترجمہ ہے جس سے مراد دل کی صفا ہے اور صفائے دل کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ عقائد نتھر کر شفاف ہو جاتے ہیں۔ عظمتِ باری کا یقین، رسالت پر ایمان اور ضروریاتِ دین کے ساتھ پختہ تر ایمان نصیب ہوتا ہے۔ جیسا کہ ترتیبِ قرآنِ کریم سے ظاہر ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (آل عمران: ۱۶۴)

کہ دعوت کے بعد پہلا کام، جو قبول کرے اس کا تزکیہ ہے اور اس کے بعد تعلیمِ کتاب وحکمت ہے۔ تو واضح ہے کہ بغیر تزکیہ کے بندہ کتاب وحکمت سے استفادہ کی اہلیت ہی نہیں پاتا اور اس درجہ یقین نصیب نہیں ہوسکتا جو اتباع اور اطاعت پر مجبور کردے اور نافرمانی سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو، جو مطلوب ہے۔ بھلا ہندوؤں کی تعلیمات سے یہ نعمت نصیب ہونا کیسے ممکن ہے؟ ہاں ہندوؤں کے ہاں بھی بڑی شدید چلہ کشیاں پائی جاتی ہیں مگر یاد رہے کہ اگر بھوکے رہ کر اور نیند نہ لے کر ارتکازِ توجہ کا ایک درجہ حاصل کر بھی لیا جائے تو اس سے ایمان نصیب نہیں ہوتا، نہ کشفِ الٰہیات نصیب ہوتا ہے کہ برزخ منکشف ہو، بالائے آسمان کا مشاہدہ ہو۔ یہ ناممکن ہے۔ ہاں جو چیزیں مادی آلات سے دیکھی جاسکتی ہیں اُن کا نظر آنا ممکن ہے جیسے ٹی وی وغیرہ سے دور کے واقعات دیکھے جاسکتے ہیں بلکہ یہ بھی کتب میں ملتا ہے کہ افریقہ میں جنگلیوں کا ایک ایسا قبیلہ پایا گیا جو دور سے آپس میں بات بھی کر لیتے تھے۔ اگر کوئی گھر سے باہر جاتا تو وقتِ مقررہ پر وہ متوجہ ہوتا، دوسرا گھر میں متوجہ ہوتا تو بات کر لیتے تھے۔ اس پر

روس کی حکومت نے کوشش شروع کی تھی کہ ایسا طریقہ فوجی مقاصد کے لیے اختیار کیا جائے۔ پھر اُن سے ہوسکا یا نہیں، اللہ کریم جاننے والے ہیں۔ اِسی طرح ایک ہندو یوگی حضرت استاذ نا المکرّم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جس نے بتایا کہ اُس نے بہت محنت کی ہے جس کے نتیجے میں اُسے یہ کمال حاصل ہے کہ جب وہ متوجہ ہوتا ہے تو ایک شکل ظاہر ہو جاتی ہے جسے وہ جہاں کہے، وہاں پہنچا دیتی ہے۔ تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تمہیں اُس شکل سے اُنس محسوس ہوتا ہے یا ڈر لگتا ہے؟ تو اُس نے کہا ڈر لگتا ہے مگر وہ میری بات مانتی ہے۔ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا وہ شیطان ہے کہ شیطان، انسان کا دشمن ہے خواہ کافر ہی کیوں نہ ہو اور دشمن سے ڈر ہی لگے گا۔

تو اُس سب کا اسلامی تصوف سے کوئی واسطہ نہیں کہ تصوفِ اسلامی میں اس طرح کی چلہ کشی کا کوئی تصور نہیں بلکہ یہ زندگی بھر کا مجاہدہ ہے کہ ہر کام شریعت کے مطابق کیا جائے اور یہ ایسا چلہ ہے جو نہ تو آسان ہے، نہ ہی اس کا کوئی بدل ہو سکتا ہے۔

عہدِ رسالت مآب ﷺ میں ایمان کے بعد جس کو ایک نگاہ نصیب ہوئی اس کا تزکیہ ہو گیا۔ جس نے آپ ﷺ کو دیکھا یا آپ ﷺ کی نگاہِ پاک جس پہ پڑ گئی وہ درجۂ صحابیت پہ فائز ہوا جو بعد نبوت اعلیٰ ترین مقام ہے مگر یہ یاد رہے کہ ذکرِ اسمِ ذات کا حکم اُن سب کے لیے بھی تھا اور آج بھی ہر مسلمان مرد و خاتون کے لیے ہے۔

دوسری بات کہ خلافِ اسلام چلہ کشی خواہ ہندو فلسفہ سے ہو یا یونانی، انسان کو دنیوی اعتبار سے ناکارہ بنا دیتی ہے اور اس کی استعدادِ کار ختم ہو جاتی ہے۔ مگر تزکیہ جہاں ایمانِ کامل عطا کرتا ہے وہاں استعدادِ کار بہت بڑھ جاتی ہے اور ایک آدمی

زندگی میں کئی آدمیوں جتنا کام کر جاتا ہے۔ آپ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر چودہ صدیوں کے حقیقی صوفیاء اور علماء ربانیین کو دیکھئے تو یہ بات واضح ہو جائے گی۔ اس پر کسی دوسری دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک عام مسلمان کلمہ گو دنیوی امور میں بھی کافر کی نسبت زیادہ استعدادِ کار رکھتا ہے چہ جائیکہ صوفی۔ یہ حضرات نکمّے نہیں، نِچلّے ہوتے ہیں اور زندگی بھر کام کرتے چلے جاتے ہیں کہ کام کرنا اور شریعت کے مطابق کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے اور دوسری عجیب بات یہ بھی ان حضرات میں پائی جاتی ہے کہ ایک وقت میں زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں اور ہر شعبے میں کامیاب رہتے ہیں جو سوائے صوفیاء کے کہیں نہیں ملتا۔ بڑے بڑے لوگ ایک اور صرف ایک شعبے میں نام کماتے ہیں جبکہ صوفیاء زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ پھر یہ حکم لگانا کہ یہ لوگ کام نہیں کرتے کس قدر ناانصافی کی بات ہے۔ لوگ دماغ سے کام کرتے ہیں جو دوسرے آلات سمع وبصر وغیرہ کا محتاج اور حالات وواقعات سے متاثر ہوتا ہے مگر صوفیاء دِل سے کام کرتے ہیں جو صرف جذبات پر فیصلہ کرتا ہے جو اس کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ دل خارجی اثرات سے بالاتر ہوتا ہے اور جب اس کے اندر اللہ ﷻ کا ذکر مقیم ہوتا ہے تو اس کا ہر فیصلہ اطاعتِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ نیز حسبِ استطاعت کبھی بیکار نہیں رہتا بلکہ دماغ، دل کے تابع اور اعضاء وجوارح دماغ کے تابع ہو کر، اس کی ساری قوت بہترین کام پہ لگی رہتی ہے۔

ہاں جن لوگوں کو شیخِ کامل نہ ملا اور انھوں نے آخرت کی بجائے دنیا کے

کمالات یا شہرت و دولت پانے کے لیے وظیفے پڑھے اور چلے کاٹے ان کی بات دوسری ہے۔ ایسے لوگوں پہ یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ یہ ہندوازم یا کسی اور سے متاثر ہوئے اور انھیں صوفی کہنا یا سمجھنا بھی ہرگز درست نہیں۔

جہاں تک صوفیاء اور اہل اللہ کا تعلق ہے تو وہ ساری محنت رضائے باری کے لیے کرتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی سے توفیقِ عمل بھی نصیب ہوتی ہے اور گناہ سے بچنے کی توفیق بھی۔ رضائے باری کے حصول کا واحد ذریعہ اتباعِ رسالت اور اجتناب عن المعاصی یعنی گناہ سے پرہیز ہے۔ صوفیاء کو بھی کشف و مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل باتوں پہ نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

اوّل۔ کشف و مشاہدہ مقصد نہیں ہوتا۔ ہاں کشف و مشاہدہ ہو جائے تو اللہ کریم کی عطا ہے۔

دوم۔ کشف قدرتِ باری پہ ایمان کو اور مستحکم کرتا ہے اور احکام کی بنیاد سمجھ میں آتی ہے نیز وضاحت بھی نصیب ہوتی ہے۔

سوم۔ یہ امورِ دنیا یا لوگوں سے اپنا آپ منوانے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اپنے عجز کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے۔

چہارم۔ اگر کشف شریعت کے مطابق ہو تو درست، اگر خلاف ہو تو پھر صاحبِ کشف کو غلطی لگی ہے۔ وہ قابلِ عمل نہ ہوگا۔

پنجم۔ اگر کشف میں کوئی بات ظاہر ہو یا کوئی کام کرنے کا اشارہ ملا تو صرف وہ خود، جو صاحبِ کشف ہے۔ اس پر عمل کرے دوسرا کوئی فرد اُس کے کشف کا مکلّف نہیں

اور نہ اُس پر عمل کرنے کا پابند ہے لہٰذا امورِ دُنیا میں تو اس کی ضرورت نہ رہی۔

## کشف و مشاہدہ کی اقسام

اول یہ ہے کہ اللہ کریم پردہ ہٹا دے اور کوئی چیز واضح دکھائی دے اور سمجھ میں آجائے مگر یہ سب اللہ کریم کی عطا پر منحصر ہوتا ہے جو بات واضح فرمانا چاہے اُس کا احسان اور جب چاہے، وہ کرے۔ جیسے حضرت یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام جدا ہوئے اور انہیں خبر نہ ہوسکی مگر جب اللہ کریم نے بتانا چاہا تو برسوں بعد جب اُنؑ کی بھائیوں سے ملاقات ہوئی اور آپ علیہ السلام نے کرتہ مبارک دیا کہ میرے والدِ گرامی کی آنکھوں پہ پھیرو، تندرست ہو جائیں گی اور قافلہ مصر سے نکلا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں فرمایا آج یوسف علیہ السلام کی خوشبو آرہی ہے۔ حالانکہ دونوں حضرات اللہ کے نبی تھے پھر ولی کی کیا حیثیت؟

دوسرا طریقہ الہام والقاء ہے یعنی بات دل میں اُتر جاتی ہے اور اس پر یقینِ کامل نصیب ہوتا ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم دیا کہ بچے کو دریا میں ڈال دو فرمایا: وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰٓی (القصص: ۷) یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ سے بات کی۔ یہ اِسی طرح ہوتی ہے کہ اِن کے دل میں بات اُتر گئی اور انھیں اس قدر یقین ہوا کہ واقعی بچہ دریا میں ڈال دیا۔ مگر یہ صرف اُن کے لیے تھا۔ اگر بنی اسرائیل کی دوسری عورتیں اُن کے وجدان پر عمل کر کے بچے دریا میں ڈال دیتیں تو وہ غرق ہو جاتے۔ یہ قسم الہام، القاء یا وجدان کہلاتی ہے۔ اِن تینوں صورتوں میں تھوڑا فرق ہوتا

ہے۔ جو آزمایا جا سکتا ہے، لکھنا شاید ممکن نہ ہو۔

تیسری قسم یہ ہے کہ فرشتہ ظاہر ہو کر بات کرے جیسے حضرت مریم علیہ السلام کا واقعہ کہ جبرائیل علیہ السلام اُن پر انسانی شکل میں ظاہر ہوئے اور بات پہنچائی۔ یہ دونوں عظیم خواتین نبی نہ تھیں۔ سو صوفی کے مشاہدے، کشف یا الہام والقاء اور وجدان کی یہ صورتیں دین پر یقین کو مستحکم کرتی ہیں۔ کتاب وسنت کو سمجھنے کی توفیق ارزاں کرتی ہیں اور توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ صوفی نکمّے ہوتے ہیں، سخت غلط فہمی ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ بہت زیادہ کام کرتے ہیں کہ انھیں توفیق الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ ہاں نقالوں کی بات الگ ہے۔ مگر ہمارے نام نہاد دانشور نقالوں کے قصے لکھ کر دین کے اس اہم جزو کو بدنام کر کے مسلمانوں کو اس سے محروم کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ العیاذ باللہ!

کشف و مشاہدہ کا ایک درجہ اور ہے جس میں اشیاء یا بات واضح نہیں ہوتی بلکہ تعبیر کی محتاج ہوتی ہے اور ایسی بات یا مشاہدہ جب طالب شیخ کو پیش کرتا ہے تو وہ اُسے تعبیر سے آگاہ فرماتا ہے۔ نیز یہ سب نبی کے معجزہ کی فرع ہوتی ہے۔ جیسے نبی کو نبوت کے ثبوت کے طور پر معجزات عطا ہوتے ہیں جو دلیلِ نبوت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ولی کو باتباعِ نبوت کرامات عطا ہوتی ہیں جو دین کے قیام اور حق کے اثبات کے لیے ظاہر ہوتی ہیں۔ جس طرح نبی کا معجزہ دلیلِ نبوت ہوتا ہے ایسے ہی ولی کی کرامت بھی دین کی حقانیت کی دلیل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ کسی فرد کی بڑائی مقصود نہیں ہوتی اور کرامات بھی فعل اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے جس کا اظہار ولی کے ہاتھ پر ہوتا ہے تو کرامت،

فعل اللہ تعالیٰ کا ، اظہار نبی کے ہاتھ پہ ہو تو معجزہ کہلاتا ہے۔

کرامت چونکہ معجزہ کی فرع ہے لہٰذا نبی کا اتباع ضروری ہے ورنہ نصیب نہ ہوگی۔ نیز کشف وکرامت از قسم ثمر ہیں اور ثمرات ہمیشہ وہبی ہوتے ہیں کہ اللہ کریم کی عطا ہوتے ہیں لہٰذا بندے کی طلب کا نتیجہ نہیں ہوتے کہ جب چاہا کرامت کا اظہار کر دیا۔ ہاں جب اللہ چاہے اس کا اظہار ہوتا ہے اور چونکہ یہ از قسم ثمرات ہیں لہٰذا اخروی اجر کے قائم مقام ہوتی ہیں۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جن سے کرامات کا ظہور ہوا حشر کو خواہش کریں گے کہ کاش یہ نہ ہوا ہوتا تو ہمارا اجر اور زیادہ ہوتا۔ ہاں دنیا کے حصول یا اپنی بڑائی کے اظہار کے لیے کچھ لوگ عجائبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اول تو وہ شعبدہ ہوتا ہے جو صرف ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے۔ دوسرے استدراج ہوتا ہے جو شیطانی قوّت کے بل بوتے پہ کیا جاتا ہے۔ مگر وہ نہ تو بالائے آسمان کی بات ہوتی ہے، نہ برزخ کی۔ محض امورِ دنیا کے بارے وہ بھی اس حد تک جہاں تک مادی آلات کی رسائی ہوسکتی ہے۔ لیکن ان سب امور کو سمجھنے کے لیے توفیقِ الٰہی اور شعور وآگہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ کہ ابوجہل کی مٹھی میں کنکریوں نے کلمہ پڑھا اور بد بخت نے کہا کہ یہ جادو ہے۔ اَب بتایا یہ جاتا ہے کہ کنکریوں نے کلمہ پڑھا۔ یہ معجزہ ہے۔ حالانکہ بات اس سے بہت ہی بڑی ہے۔ کنکر، پتھر، جمادات ونباتات حتیٰ کہ ذرہ ذرہ اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (الاسراء:۴۴) کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح اور حمد بیان کرتی ہے۔ تو پتھر، کنکر، پہاڑ، دریا ہر آن ذکرِ الٰہی میں مصروف ہیں۔ ہمیں

ادراک نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی سماعتوں کو اُس وقت وہ لطافت عطا کر دی کہ انھیں کنکریوں کا ذکر سنائی دینے لگا اور کمال یہ ہے کہ بدترین کفار نے بھی سنا کہ مومن کا سننا تو بڑی بات نہیں۔ بلکہ صوفیاء میں آج بھی مراقبہ کرایا جاتا ہے جس میں جمادات و نباتات سے کلام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ بندہ کے رُو برو ایک بزرگ ساتھی حضرت رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں بیان کر رہے تھے کہ فلاں شخص کی بیٹھک میں، جہاں انھیں ٹھہرنا پڑا تھا، مجھے چھت کی لکڑیاں کہہ رہی تھیں کہ ''قاضی صاحب خوش بخت لکڑیاں ہیں جو مساجد کی چھت بن گئیں اور رات دن اللہ کا ذکر سنتی اور دیکھتی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ زنا کے نظارے کرنا پڑتے ہیں۔'' تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ تو نیک آدمی ہے (جس کی بیٹھک تھی) تو عرض کیا کہ اس کے بیٹے، بھتیجے جو نوجوان ہیں ان کا کردار ایسا ہے۔

یہ فیض ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ چودہ صدیاں بعد والا بندۂ مومن جمادات سے بات کر لیتا ہے اور ان کی سن لیتا ہے۔ معجزہ یہ ہے کہ بدترین کافر کو بھی ایک وقت کے لیے ایسا کر دیا کہ اُس نے جمادات کی باتیں سن لیں۔ معجزۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل تابناک پہلو یہ ہے جس کی طرف آج شاید کسی کی نظر بھی نہیں جاتی۔

یہی حال کراماتِ اولیاء کا ہوتا ہے۔ کرامت یہ ہے کہ کتنے لوگوں کی اصلاح ہوئی۔ عقائد درست ہوئے یا اعمال کی اصلاح نصیب ہوئی اور یہی اہل اللہ کا کمال ہے کہ وہ اقامتِ دین کا کام کر جاتے ہیں۔ جو کام تقریروں، تحریروں اور بڑے بڑے جلسوں سے نہیں ہوتا وہ خاموشی سے کر جاتے ہیں۔ دلوں کو ذاکر بنا کر روشن کر دیتے

ہیں۔جس کے سبب عملی زندگی کی اصلاح ہوتی ہے۔بندہ نے حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کی ربع صدی کی رفاقت میں دیکھا کہ کسی آنے والے کو ٹوکتے نہ تھے اور نہ ہی پوچھتے تھے کہ دیوبندی، بریلوی، یا اہلِ حدیث، کون ہو؟ مگر دوسرے ہی روز اس بندے کو خود سے ہی اصلاحِ عقائد و اعمال کی فکر دامن گیر ہو جاتی تھی۔ یہ کمال بھی برکاتِ نبوت کا ہے جو اہل اللہ کے طفیل نصیب ہوتی ہیں۔

# ذکرِ قلبی
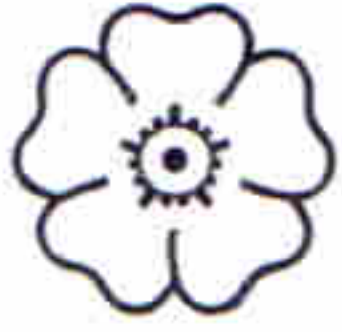
ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ جسم کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست اور صالح ہے تو سارا بدن صالح ہے، اگر وہ فساد زدہ ہے تو سارا بدن فساد کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔تو قلب سے مراد، گوشت کے لوتھڑے یعنی دل (جو خون پمپ کرنے کی مشین ہے) کے اندر ایک لطیفۂ ربانی ہے۔اور عالمِ امر سے ہے۔

## لطائف

جس طرح بدن کے اعضائے رئیسہ ہیں اِسی طرح روح کے بھی اعضائے رئیسہ ہیں۔ بدن مادی ہے، اعضاء بھی مادی ہیں۔مگر روح عالمِ امر سے ہے لہٰذا اس کے اعضائے رئیسہ بھی عالمِ امر سے ہیں ان کو لطائف کہا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں کہ انسان پانچ نہیں دس چیزوں سے بنا ہے۔ پانچ اجزائے بدن ہیں اور پانچ لطائفِ روحانی۔ بدن کے اجزاء مٹی، آگ، ہوا، پانی اور ان کے ملنے سے نفس بنا۔ یہ پانچ ہوئے۔ جبکہ روح کے پانچ لطائف ہیں۔قلب، روح، سری، خفی اور اخفا۔ یہ پانچوں لطائف ہر روح

میں موجود ہیں اور انھیں میں انوارات کو قبول کرنے، محسوس کرنے اور کیفیات پانے کی استعداد ہے۔

یہ پانچوں لطائف تو بنیاد ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے تو ان پر وارد ہونے والے انوارات کے رنگ بھی تحریر فرمائے ہیں۔ نیز مختلف سلاسل میں ان پانچوں کو بنیاد مانا گیا ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق بعض نے مزید لطائف بیان فرمائے کہ سات ہیں اور بعض کے نزدیک گیارہ بھی ہیں۔ یہ توجیہات ذوقی ہیں۔ یعنی کشف و مشاہدہ اپنا اپنا ہے۔ لیکن سب کی بنیاد یہی پانچ ہیں اور پھر پانچ کا حاصل بھی ایک ہے لطیفۂ قلب ۔ کہ سب اذکار کا حاصل آخر اسی کی روشنی اور جلا ہے۔

ہمارے ہاں سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ میں سات لطائف پہ ذکر کیا جاتا ہے۔ جن میں چھٹا لطیفہ نفس ہے، ساتواں لطیفہ سلطان الاذکار۔ نیز ان کے مقامات کی تعیین میں بھی مختلف سلاسل میں مختلف مقامات بیان ہوئے ہیں اور یہ اختلاف اپنے اپنے ذوق اور مشاہدے پر مبنی ہے ورنہ منزل سب کی ایک ہے اور شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے رائے کا اختلاف باعثِ برکت ہوا کرتا ہے۔ الحمد للہ۔ ہر آدمی کا اپنا مزاج اور اپنا ذوق ہوتا ہے۔ کسی کو ایک طریقہ زیادہ مفید ہے تو کسی کو دوسرا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض شیوخ طالب کو دوسرے شیخ کے پاس بھیج دیتے تھے کہ تمہارا حصہ وہاں ہے۔ اِس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ولایت کوئی جاگیر ہے اور مختلف لوگوں کے پاس اِس کے مختلف حصے ہیں بلکہ وہ ان کا ذوق دیکھ کر اندازہ فرماتے تھے کہ انھیں وہاں سے فائدہ ہوگا۔ وگرنہ تو ہر مومن ولی اللہ ہے۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (البقرۃ: ۲۵۷) یہ رسید ہے

اِس بات کی کہ اللہ ہر مومن کا دوست ہے اور اسے ایک درجہ ولایت کا حاصل ہے ہاں مشائخ اسے پالش فرماتے ہیں اور مزید قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔ مزید توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے تو قربِ الٰہی میں مزید ترقی نصیب ہوتی ہے اور درجہ احسان یعنی حضورِ حق کا ادراک نصیب ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعۃ:۴)

# مقاماتِ لطائف

# اور

# ان پہ برکات

# پہلا لطیفہ، قلب

یہ اسی گوشت کے لوتھڑے کے اندر ہے جو سارے بدن کو خون پہنچاتا ہے۔

ایک لطیفۂ ربانی ہے جو عالمِ امر سے ہے۔ اس پہ حضرت آدم علیہ السلام کے انوارات آتے ہیں، جو آسمانِ اول سے آتے ہیں اور زرد رنگ کے انوارات ہوتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام میں حضور ﷺ تو امام الانبیاء ہیں باقی حضرات نبی ہیں، رسول ہیں اور اولوا العزم ہیں۔ یہ حضرات پانچ ہیں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کا فیض ابتدائی چار لطائف پہ نصیب ہوتا ہے۔ ان سب کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ پہلے لطیفے پر آدم علیہ السلام کے انوارات، آسمانِ اول سے آتے ہیں زرد رنگ کے ہوتے ہیں اور مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی بات کہ جس طرح اُن سے بھول ہوئی تو فوراً متوجہ الی اللہ ہوئے اور تقربِ الٰہی حاصل ہوا۔ یہ لطیفہ کرنے سے یہی احساس منتقل ہوتا ہے اور خلوصِ دل سے توبہ نصیب ہوتی

ہے اور بندہ حضورِ حق میں ہر خطا کی معافی اور توفیقِ اطاعت کا طلب گار ہوتا ہے۔ دوسرے جس طرح انھیں علمِ لدُنّی نصیب ہوا اور فرمایا: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۱) کہ آدم علیہ السلام کو اشیائے عالم کے اسماء سکھا دیے۔ ہر شے کا نام، خصوصیت، طریق استعمال اور نفع نقصان بتا دیا گیا۔ اسی طرح طالب کو استعداد حصولِ علم نصیب ہوتی ہے۔ اور دین و دنیا کے جس شعبے میں محنت کرتا ہے، اعلیٰ مقام پاتا ہے۔ یاد رہے کہ علومِ عقلیہ اور دنیا میں بھی غیر مسلم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور دین تو خیر حصہ ہی مومن کا ہے۔ اِسی لیے آج کے ترقی یافتہ علوم کی بنیاد مسلمان محققین کی مرہون منت ہے جو سب ذاکر اور ولی اللہ تھے۔ آج اگر ہم نے یہ نعمت ترک کر دی ہے تو کافر کے دستِ نگر ہو گئے ہیں۔

یہ آدم علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے زمین سے چیزیں اگانا شروع کیں۔ جڑی بوٹیوں اور دھاتوں کا استعمال شروع فرمایا۔ تو سالک کو ان تمام امور کی استعداد نصیب ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس عالم میں آپ سری لنکا کے پہاڑ پہ اترے۔ اماں حوّا عرب میں تھیں۔ آپ نے تین سو سال مجاہدہ کیا، سفر کیا، اللہ کریم سے رو رو کر دعائیں کیں تو اس میں کتنی جسمانی محنت، کتنی دماغی کاوش اور کتنا دردِ دل شامل ہوا۔ آخر عرفات میں جبلِ رحمت پہ ملاقات ہوئی (جہاں آج بھی مینار بنا ہوا ہے) اور نسلِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔ تو یہ کیفیات سالک کو بھی اس کی استعداد اور طلب میں خلوص کے مطابق نصیب ہوتی ہیں۔ وہ عبادات میں مجاہدہ کرنے والا، دنیا کے امور سے واقف

اور مشکل ترین کام کرنے کی ہمت پاتا ہے اور ان سب امور کے باوجود اس کا رابطہ ربّ کریم سے رہتا ہے۔ مدد بھی طلب کرتا ہے اور کمی یا کوتاہی پر بخشش بھی کہ انسان کا مزاج عجیب شے ہے، کبھی اسے اپنی کاوش میں کامیابی نصیب ہوتی ہے تو تکبر کا شکار ہوجاتا ہے اور کہتا ہے یہ میرا کمال ہے مگر جس کا قلب ذاکر ہو اور اللہ کریم کی طرف متوجہ ہو وہ اِس مصیبت سے محفوظ رہتا ہے اور کامیابی کو اللہ کریم کی عطا سمجھتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ نہ صرف کامیابی بلکہ محنت کرنے کا حوصلہ اور توفیق کو بھی اللہ کریم کی عطا جانتا ہے اور اس میں مزید عجز اور انکسار پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر ناکامی ہوتی ہے تو ردِعمل میں بیزاری کے ساتھ ساتھ تقدیر کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش بھی کرتا ہے اور یوں تقدیر کے نام پر دراصل اللہ ﷻ پر الزام لگاتا ہے۔ لیکن اگر قلب ذاکر ہو تو تاثر مختلف ہوتا ہے کہ اپنی کوشش پر تو خوش ہوتا ہے اور پھر یہ سوچتا ہے کہ کہیں کوئی کمی مجھ سے ہی رہ گئی جو مطلوبہ نتائج نہ مل سکے اور اگر کوشش بھی درست تھی تو یہ شے یا نتیجہ، اپنے نتیجہ اور مآل کے اعتبار سے یقیناً میرے حق میں بہتر نہ تھا۔ جبھی میرے مالک نے بدل دیا۔

اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ کوشش اور محنت کا اَجر اسے اللہ کریم سے ضرور نصیب ہوگا۔ لہٰذا ناکامی میں بھی ایک درجہ کامیابی نظر آتی ہے اور یوں کبھی مایوس نہیں ہوتا، نہ اس کی آس ٹوٹتی ہے۔ وہ محنت و مشقت کو بھی اللہ کریم کی عطا جانتا ہے اور آرام وسکون کو بھی اس کی بخشش۔ چنانچہ اس کی زندگی پرسکون اور آرام دہ ہوجاتی ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے جنت میں کسی کو کوئی دکھ نہ ہوگا۔ اِس بات کا ہلکا سا شائبہ

ذاکرین کی حیاتِ دنیا میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اِس عالم کی زندگی بھی پر لطف ہو جاتی ہے اور آخرت بھی سنور جاتی ہے۔

یوں صرف قلب کا ذاکر ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے ان بے شمار نعمتوں کے دروازے اس پر کھول دیے گئے ہوں اور وہ ایک ایسے بڑے دربار میں پہنچ چکا ہو جہاں ہر طرف، ہر قسم کی نعمتیں اس کی منتظر ہوں۔ دیکھیں کہ وہ اس میں کیا کیا حاصل کرتا ہے۔

یہ صرف کہنے کی باتیں نہیں، کرنے کے کام ہیں کہ مُشتِ غبار میں وہ انوارات اثر پذیر ہوں جو اولوا العزم رسولوں کے قلوب پہ وارد ہوتے ہیں، تو وہ کیا بن سکتے ہیں۔ مزید بے شمار چیزیں ہوں گی جو سب میں جانتا بھی نہیں اور یہاں لکھنا ممکن بھی نہیں۔

# دوسرا لطیفہ، رُوح

اِسے لطیفۂ رُوح کہتے ہیں اور یہ قلب کے مقابل دائیں طرف ہے۔ اِس پر دو اولوا العزم رسولوں کے انوارات آتے ہیں۔ یہ انوارات دوسرے آسمان سے آتے ہیں۔ ان کا رنگ سنہری مائل سرخ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے فرشتہ رُوح قبض کرتا ہے۔ مراقبہ موتوا قبل ان تموتوا کرایا جائے تو سالک قبضِ رُوح کی حالت کا مشاہدہ کرسکتا ہے۔ جن دو ہستیوں کے انوارات اِس پہ آتے ہیں ان میں پہلے حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور دوسرے حضرت ابراہیم علیہ السلام۔ اِن دونوں حضرات کے حالاتِ مبارکہ میں تقریباً یک رنگی ہے کہ نوح علیہ السلام نے نوسو پچاس برس تبلیغ کی دراں حالیکہ ان کی قوم بہت بگڑ چکی تھی اور اتنے طویل عرصے کی محنت کے باوجود ایمان والے مرد وزن کی تعداد تقریباً اَسّی (۸۰) کے قریب تھی۔ کتنا کٹھن اور بے مثال مجاہدہ تھا اور کیا استقلال تھا آپ کی تبلیغ میں۔ ان کی قوم کے بگاڑ کا ایک سبب اُن کی مادی ترقی بھی تھی کہ انھوں نے اُس دور میں ایسی ایجادات کرلیں تھیں جو آج تک،

اتنی مادی ترقی کے باوجود نہیں ہوسکیں مثلاً انھوں نے ایک ایسا محلول تیار کرلیا تھا جو اگر سنگ مرمر جیسے سخت پتھر پر ڈالا جاتا تو وہ موم ہو جاتا۔ جو مختلف شکلوں میں ڈھالا جاتا اور پھر سخت ہو جاتا۔ مگر اس میں یہ خصوصیت پیدا ہو جاتی کہ دن میں سورج کی روشنی جذب کرتا اور ساری رات روشن رہتا۔ چنانچہ گھروں، گلیوں اور راستوں پہ انھیں نصب کر دیا جاتا تھا اور وہ رات بھر روشن رہتے تھے۔ مغربی محققین کو کھدائی میں کہیں ایک بوتل ہاتھ لگ گئی تھی۔ جس سے انھوں نے تجربہ تو کرلیا مگر بوتل گر کر ٹوٹ گئی لہٰذا اس کے اجزاء کا پتہ نہ چل سکا۔ اِس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے باغات، ذرائع آب رسانی، فصلیں اور طرزِ رہائش کس قدر ترقی یافتہ ہوں گے۔

چنانچہ عہدِ حاضر کی طرح انہوں نے عظمتِ الٰہی کو فراموش کر دیا اور تعلیماتِ نبوت کو ناقابلِ عمل قرار دیا جس کے نتیجے میں طوفان برپا ہوا اور سوائے ایمان لانے والوں کے سب غرق ہو گئے۔ حضرتؑ کا ایک سگا بیٹا بھی غرق ہونے والوں میں تھا۔ بلکہ سورۃ ھود میں جو ارشاد ہے:

يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ (ھود:۴۴)

کہ اے زمین پانی جذب کرلے اور آسمان برسنا روک دے تو جہاں پانی جذب ہوا میری سمجھ کے مطابق وہی جگہ برمودا ٹرائی اینگل (Bermuda triangle) ہے کہ جس کی زد میں آج بھی جو شے آتی ہے زمین کی تہوں میں اُتر جاتی ہے۔ وہ بحری جہاز ہو یا ہوائی جہاز، پھر اُس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

چنانچہ آپ کی کشتی کوہِ جودی پہ رُکی اور آپ علیہ السلام نے پھر اُسی محنت اور

جذبے سے دنیا آباد کی اور آدمِ ثانی کہلائے اِستقامت، عقیدے اور اعمال میں، اور اسی بنیاد پر پھر انسانیت کی آبیاری فرمائی۔

لہٰذا ان برکات کا پرتو جب سالک پر وارد ہوتا ہے تو عقیدے کی اصلاح، استقامت اور دنیا میں حق پر عمل اور اس کی اشاعت میں پامردی جیسے اوصاف نصیب ہوتے ہیں۔ حق کی اشاعت میں تائید باری نصیب ہوتی ہے۔ نیز باطل قوتوں کے خلاف دُعا قبول ہو کر امدادِ غیبی کا سبب بنتی ہے۔

اِسی دوسرے لطیفے یعنی لطیفہ روح پر دوسرے انوارات حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ہوتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دونوں حضرات کے انوارات مل کر سرخی مائل سنہری نظر آتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اولوا العزم رسول ہیں۔ بچپن میں گھر سے ابتدا ہوئی تو خود والد سے اختلاف ہوا کہ اُن کے والد شاہی بت کدہ کے لیے بت بنایا کرتے تھے۔ عموماً لوگ اپنے بڑوں کی پیروی کرتے ہیں مگر انبیاء علیہم السلام صرف اللہ ﷻ کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں جو انھیں وحیِ الٰہی سے نصیب ہوتا ہے۔ پھر معاشرے سے ٹکر ہوئی۔ جب آپ نے بت کدہ کے بت توڑ دیے اور بات بادشاہ تک پہنچی، دربارِ شاہی میں بات ہوئی، آپ نے بادشاہ کو لاجواب کر دیا تو اُس نے جھلا کر آپ کو آگ میں ڈالنے کا حکم دیا۔ مگر اللہ ﷻ نے آگ کو حکم دیا کہ تو بے شک آگ ہے، جلانا تیرا کام ہے، مگر تو آگ ہی رہ کر میرے خلیلؑ کے لیے بادِ بہاری بن جا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ آگ گلزار ہو گئی، یہ بات قرآن کے ارشاد کے مطابق سمجھ نہیں آتی کہ وہاں گلزار بننے کا حکم نہیں۔ بلکہ فرمایا:

يٰنَارُ كُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ (الانبیاء:٦٩)

کہ اے آگ جلانا چھوڑ کر میرے خلیل کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث بن جا۔ لہٰذا آگ لکڑیوں کو تو جلاتی رہی مگر خلیل اللہ علیہ السلام کے لیے بہار ساماں ہو گئی۔

پھر آپؑ نے ہجرت کی اور بے شمار مشکلات کا سامنا استقامت سے فرمایا۔ پھر بڑھاپے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسے فرزند سے نوازا تو اہلیہ محترمہ اور بچے کو بیت اللہ شریف کے مقام پر چھوڑنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ مائی صاحبہ کا صبر، پھر پانی کی تلاش، زمزم کا نکلنا اور پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی، غرض ایک مسلسل مجاہدہ، ایثار اور صبر و استقامت کی داستان ہے۔ جس میں قدم قدم پر رحمتِ باری تعالیٰ لپک لپک کر ہاتھ تھام لیتی ہے۔ ایک عجیب داستان ہے جسے صرف عشق کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے ورنہ مادی نگاہ کی ان جذبات و کیفیات تک رسائی نہیں۔

چنانچہ سالک کو بھی ان تمام کمالات کا عکس نصیب ہوتا ہے اور وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان سے حصہ پاتا ہے۔ یاد رہے! اس کے لیے صدقِ دل، خلوصِ نیت اور مجاہدہ شرط ہے اور ان برکات کو جاننے والے ہی جان سکتے ہیں۔ اس طرح آج تک قلمبند نہیں ہوئے۔ نہ جانے بندۂ فقیر نے یہ جرأت کیوں کی؟ شاید زمانہ صرف مادی کمالات میں کھو گیا تو اللہ کریم کو منظور ہوا کہ اصل کمالاتِ انسانی کیا ہیں؟ اور کیسے حاصل ہوتے ہیں؟ سے بھی عامتہ الناس کو آگاہی ہو اور اس نے فقیر کو توفیق بخشی اور ان شاء اللہ یہ دنیا میں پھیلے گا اور طالبانِ حق کی راہنمائی ضرور کرے گا۔ ہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جسے نصیب ہو اس میں کیا تبدیلی آتی ہے؟ یہ وہ خود ہی بہتر جان سکتا ہے

کہ ہر شخص کا حال مختلف ہوتا ہے اور مجبوریاں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ لہٰذا نتائج بھی الگ الگ مرتب ہوتے ہیں۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ فائدہ ہر فرد کو ہوتا ہے کہ یہ برکات اور انوارات کبھی بے نتیجہ نہیں رہتے بھلا اللہ کریم کا نام ہو اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کی برکات ہوں تو بے نتیجہ تو ہرگز نہیں رہ سکتیں۔ ہاں ہر فرد کی فیض کو قبول کرنے کی استعداد مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا نتائج افراد کی استعداد کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور آخرت کا یقین اس حد تک نصیب ہوتا ہے جسے علماً استحضار فرماتے ہیں یعنی آخرت کی حقیقتیں جیسے سامنے نظر آ رہی ہوں۔ یہ نعمت انسانی زندگی کو سنوارنے کا سب سے مؤثر اور اعلیٰ سبب بنتی ہے۔

# تیسرا لطیفہ، سری

لطیفہ سری کا مقام پہلے لطیفے کے اوپر ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فیض آتا ہے جو تیسرے آسمان سے آتا ہے۔ اِس کے انوارات کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ کبھی لگاتار سفید روشنی اور کبھی سفید گالوں کی بارش، کبھی سفید بادلوں کا جھرمٹ، غرض اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہر کوئی مشاہدہ کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ پر نظر ڈالیں تو ولادت کے ساتھ ہی دریا میں ڈال دیے گئے۔ عجیب آزمائش شروع ہوگئی مگر اِس کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے کہ ان کے طفیل ان کی والدہ ماجدہ کو بھی شرف ہمکلامی سے نوازا گیا۔ ارشاد ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (القصص:۷)

ہم نے والدہ موسیٰؑ سے بات کی۔

سبحان اللہ! گویا یہاں سالک کو تو جو نصیب ہوتا ہے الحمدللہ مگر اس کے طفیل

اس کے متعلقین کو بھی برکات پہنچتی ہیں۔

پھر دریا سے شاہی محل میں پہنچ گئے اور فرعون کے ہاں بچپن، لڑکپن اور جوانی تک مقیم رہے۔ کہا جاتا ہے کہ معاشرہ اور ماحول انسان کو بدل دیتا ہے مگر فرعون کا شاہی محل اور اس کا ماحول موسیٰ علیہ السلام کو تو نہ بدل سکا۔ چنانچہ ان برکات کا انعکاس سالک پر بھی ہوتا ہے اور وہ ماحول میں ڈھلنے کی بجائے ماحول کو بدلنے کی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے۔

جوانی میں ایک قبطی کا حادثاتی طور پر عدل کی حمایت میں ان کے ہاتھوں مارا جانا، فرعون کا ان کے قتل کا قصد اور ان کا ہجرت فرما جانا اور مدین چلے جانا، وہاں شعیب علیہ السلام کی بچیوں سے ملاقات، پھر اُن کے ہاں شادی بھی ایک عجیب مرحلہ ہے کہ جب کنویں پہ پہنچے تو دیکھا کہ چرواہے ریوڑوں کو پانی پلا رہے ہیں اور دو بچیاں الگ سے کھڑی ہیں۔ پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ اُن کے والد ضعیف ہیں، کوئی اور ہے نہیں جو ریوڑ لے کر آئے۔ جب دوسرے لوگ چلے جائیں گے تو ہم اپنے ریوڑ کو پانی پلائیں گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگے بڑھ کے ڈول کھینچا اور اُن کے ریوڑ کو پانی پلایا۔ وہ چلی گئیں تو ایک سایہ دار جگہ پر بیٹھ گئے اور دعا کی:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (القصص:۲۴)

یا اللہ نہ گھر بار، نہ واقف کار، سخت احتیاج کا عالم ہے۔ خیر عطا فرما۔ تو اُن بچیوں میں سے ایک، جس کے چلنے کے انداز سے بھی حیا ٹپک رہی تھی، انھیں بلانے آئی۔ گویا عورت ہر سوال کا جواب تھی۔ رشتہ داری بھی ہو گئی، ٹھکانا بھی مل گیا، روزگار

بھی کہ باحیا عورت تمام نعمتیں ساتھ لاتی ہے۔

پھر روانگی، طُور پہ تجلیات باری کا مشاہدہ اور کلامِ الٰہی اور پھر فرعون کو دعوتِ حق دینے کا حکم۔ایک ایسے سرکش بادشاہ کو جو اپنی خدائی کا دعویدار تھا، دعوتِ الی اللہ۔ پھر جادوگروں سے مقابلہ۔ اِن دونوں مقامات پر توکل علی اللہ کی عظیم مثال اور پھر برسوں قبطیوں اور فرعون سے مقابلہ و مجادلہ۔ پھر بنی اسرائیل کو لے کر ہجرت، سمندر سے راستہ ملنا، کوہِ طور پر حاضری، کلامِ الٰہی اور کتاب کا عطا ہونا، پھر آگے سفر جہاد، غرض ایک جہدِ مسلسل ہے۔ بظاہر ہر کام کی ابتدا مشکلات سے ہوتی ہے اور انتہا عطائے الٰہی پر۔آپ علیہ السلام کی حیات بے شمار عجائبات کی طویل داستان ہے جسے یہاں سمونا ممکن نہیں۔

جب سالک کے لطیفہ پر ان کے انوارات آتے ہیں تو اُن میں وہ سب طرح کی برکات ہوتی ہیں۔ اپنی حیثیت کے مطابق ہر سالک اُن سے مستفید ہوتا ہے۔اللہ کریم پر بھروسہ نصیب ہوتا ہے۔حق بات بڑے سے بڑے جابر کے سامنے کہنے کا حوصلہ پاتا ہے اور حق پر استقامت نصیب ہوتی ہے۔ نیز دمِ واپسیں تک غلبۂ حق کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ یہ اور بات کہ نقلی صوفی محض نکمّے ہوتے ہیں ورنہ جنھیں یہ نعمت نصیب ہوتی ہے وہ انقلاب آفرین شخصیات بن جاتی ہیں اور شاید میں یہ بات بار بار لکھ چکا ہوں کہ ہر سالک کو اُس کی استعداد کے مطابق حصہ ملتا ہے۔ سب ایک سا حصہ نہیں پاتے۔ ہر ایک کے خلوص اور مجاہدہ، دونوں کا مقام اپنا اپنا ہوتا ہے۔اسی اعتبار سے برکات سے حصہ نصیب ہوتا ہے۔

# چوتھا لطیفہ، خفی

اِس کا مقام سینہ پر دوسرے لطیفے کے اوپر ہے اور اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انوارات آتے ہیں۔ جو چوتھے آسمان سے آتے ہیں اور ان کا رنگ گہرا نیلا ہوتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام جیسی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَاللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ (آل عمران:۵۹)

اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف تخلیق میں بلکہ بہت سے کمالات میں بھی مماثلت ہے اور برکات میں بھی۔

جیسے اُن کی ولادت قدرتِ باری سے ہوئی بظاہر کوئی سبب نہ تھا۔ ایسے ہی سالک کے بہت سے امور قدرتی طور پر حل ہوتے رہتے ہیں۔ جس طرح انھوں نے بچپن میں توحید باری، اپنی نبوت، امورِ دنیا و آخرت کا اظہار فرمایا۔ ایسے ہی سالک کو اللہ کریم کی طرف سے علوم عطا ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر کوئی سبب نہیں ہوتا۔ آپ کی بے شمار کرامات تھیں جو قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں۔ سالک کو ان کیفیات سے حصہ

نصیب ہوتا ہے اور حق بات پہنچانے کی جرأت نصیب ہوتی ہے۔ دشمنانِ حق سے اللہ ﷻ کی حفاظت اور عبادات واذکار کی توفیق عطا ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات کہ سالک کو حق کی تائید اور ناحق کو مٹانے کا جذبہ وتوفیق بخشے جاتے ہیں کہ کائنات کا نظام عدل پر قائم ہے۔ یہ قدرتِ باری ہے کہ عدل ہر کام اور ہر شے میں ضروری ہے۔ آپ دال روٹی ہی دیکھ لیں۔ نمک، مرچ یا کسی چیز میں کمی بیشی ہو جائے تو کھانا بے مزہ ہو جاتا ہے۔ دوا کے نسخے میں اجزاء کی کمی بیشی ہو جائے تو نفع کی بجائے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی امورِ دُنیا میں نور اور ظلمت میں بھی توازن رہتا ہے۔ اگر صرف ظلمت غالب آجائے تو نظامِ کائنات تباہ ہو جائے۔ جیسے اگر ہمیشہ کے لیے رات ہو جائے تو کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ یونہی دن رات کی طرح ہر شے میں ایک توازن رہتا ہے اور جہاں لاکھوں لوگ برائی کرتے ہیں وہاں اللہ کریم ایسے بندے بھی پیدا فرما دیتا ہے جو ایک ایک بندہ ایسے کردار اور برکات کے ایسے معیار کا حامل ہوتا ہے کہ ان کی ظلمتِ گناہ کا مقابلہ اس پر وارد ہونے والے انوارات کرتے ہیں اور نبوت کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ان کے اولیاءِ اُمت یا علمائے ربانی ہی اِس سعادت سے سرفراز فرمائے گئے۔ لہٰذا یہ نظام اسی طرح سے رواں دواں ہے مگر عجیب بات ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا گیا اور آخری عہد میں پھر زمین پر جلوہ گر ہو کر غلبۂ حق کا سبب بنیں گے۔

فقیر کی سمجھ میں اس کی ایک حکمت یہ آئی کہ ایسا دور آئے گا کہ ظلمتِ گناہ اِس قدر بڑھ جائے گی کہ انوارات ِ ولایت اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گے تو نورِ نبوت کی

ضرورت ہوگی اور نبوت تو مکمل ہوچکی، کوئی نیا نبی مبعوث نہ ہوگا۔ اللہ کریم ربّ ہے سب ضرورتوں سے آگاہ بھی ہے اور انھیں پوری بھی کرتا ہے چنانچہ اس نے اپنے کرم سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لیا۔ ضرورت کے وقت نزول فرمائیں گے اور شریعتِ محمدی ﷺ کا اجرأ کریں گے۔ ان کی قوت اور انوارات نبوت کے ہوں گے جو اِس ظلمت کو شکست دیں گے۔

چوتھا لطیفہ کرنے سے یہ برکات سالک پر بھی وارد ہوتی ہیں اور وہ کفر و شرک اور گناہ کی تاریکیوں کے مقابلے میں مینارۂ نور ثابت ہوتا ہے اور یہ اِتنی بڑی سعادت ہے کہ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہاں رزقِ حلال، صدقِ مقال اور خلوصِ نیت اور مجاہدہ شرط ہے۔ پھر عطائے باری کا تماشا دیکھیے۔

میاں! لکھا تو بہت کچھ جا سکتا ہے مگر محض کتاب کا حجم بڑھانا مقصود نہیں، بات سمجھانا مقصود ہے اور بتوفیقِ الٰہی فقیر کا خیال ہے کہ سمجھنے کے لیے لکھا گیا کافی ہے۔

# پانچواں لطیفہ، اخفا

اِس کا مقام سینے کے درمیان ہے۔ جہاں سینے کی ہڈی پیٹ سے ملتی ہے گویا پہلے چاروں لطائف کے درمیان۔ اِس پر آقائے نامدار حضرت محمد ﷺ کا فیض اور انوارات آتے ہیں۔ یہ پانچویں آسمان سے آتے ہیں۔ ان کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! کوئی کیا کیا شمار کرسکتا ہے کہ اول و آخر تمام انبیاء کرامؑ کو جو نعمتیں، برکات، علوم اور معجزات نصیب ہوئے وہ سب آپ ﷺ کے واسطے سے نصیب ہوئے کہ آپ ﷺ نبیوں کے بھی نبی اور امام الانبیاء ہیں۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

تو آپ ﷺ سے جو برکات نصیب ہوتی ہیں وہ اِن تمام کمالات کو حاوی ہوتی ہیں۔ یہ اور بات کہ آدمی کی فطری استعداد خاص ہوتی ہے اُس میں وہ زیادہ ترقی کر جاتا ہے مگر دوسری خصوصیات سے بھی محروم نہیں رہتا۔

سب سے پہلے اور سب سے قیمتی بات! کہ عقائد میں تمام انبیاءؑ ایک ہیں۔ سب عقیدۂ توحید، رسالت، کتاب، آخرت، ملائکہ، حساب کتاب، جنت و دوزخ پر متفق ہیں۔ تو گویا سالک کی اصلاح، عقیدہ کے متعلق بہت اعلیٰ اور یقینی ہو جاتی ہے۔ فقیر نے پچیس برس اپنے شیخ کے ساتھ گزارے حالانکہ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نہ صرف متبحر عالم تھے بلکہ بہت ہی بلند پایہ مناظر بھی تھے اور مناظر حضرات کا مزاج ہوتا ہے کہ ہر معاملہ میں کرید بھی کرتے ہیں اور تنقید بھی۔ مگر حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے آنے والے سے کبھی نہیں پوچھا کہ عقیدہ کیا ہے؟ اعمال میں کتنی پابندی کرتے ہو؟ یا کس ماحول میں رہتے ہو؟

آپ رحمتہ اللہ علیہ نے لطائف پہ توجہ دی اور پابندی کی تلقین کر دی۔ فقیر کا مشاہدہ ہے کہ بندے کے اندر جستجو پیدا ہو جاتی اور وہ اپنی اصلاح خود کرتا۔ فرائض کا پابند بلکہ تہجد گزار بن جاتا اور کلبوں اور ناچ گھروں سے نکل کر مساجد کی آبادی کا سبب بن جاتا۔ یہ برکات حضور اکرم ﷺ کی توجہ اور انواراتِ مبارکہ کی ہوتی ہیں۔

حضور اکرم ﷺ ساری انسانیت، سارے زمانوں اور سارے معاملات کے امام اور رسول ہیں۔ امورِ دنیا میں، زندگی کے ہر شعبے میں آپ ﷺ کے نقوشِ کفِ پائے مبارک موجود ہیں جو نہ صرف راہنمائی فرماتے ہیں بلکہ زندگی کو سہل بناتے ہیں اور سو فیصد کامیابی کی ضمانت دیتے ہیں اور دنیاوی کاموں پر آخرت اور اُخروی کامیابی بطورِ انعام نصیب ہوتی ہے لہٰذا جو بندہ زندگی کے جس شعبے سے متعلق ہو اس میں اُسے بہت کامیابی نصیب ہوتی ہے کہ اُسے کام کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے اور وہ ہر کام

پورے خلوص سے بھی کرتا ہے۔ ایک بات اور! کہ نہ صرف کام کرنے کا سلیقہ اور شعور نصیب ہوتا ہے بلکہ استعدادِ کار بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی:

ع گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

طالب کو کام کرنے کی صلاحیت بھی ربِّ کریم عطا فرما دیتا ہے اور یہ لوگ دُنیا و آخرت میں کامیاب ترین لوگ ہوتے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ کی برکات گنوانا ناممکن ہے اور اللہ کی عطا کو شمار کرنا بھی ناممکن۔ لیکن سب سے عجیب بات کہ پھر اس کے دعویداروں کو بھی بھٹکتے دیکھا۔ وجہ یہ ہے کہ تمام برکات کے حصول کی بنیاد خلوص پر ہے اور یہ نعمت دل کے فیصلے پر رکھ دی گئی ہے۔

يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ (الشوریٰ: ۱۳)

یعنی جو خلوصِ دل سے آرزو کرتا ہے اللہ کریم اُسے ہدایت نصیب فرماتے ہیں۔ اب یہ خلوص ایسی دولت ہے جو عظمت میں پہاڑوں سے بلند تر مگر نزاکت میں شیشۂ دل سے بھی نازک تر ہے۔ درست ہو تو طلبِ حق پیدا ہوتی ہے۔ اللہ کریم اپنے اُن بندوں سے ملا دیتے ہیں جہاں سے برکاتِ رسالت نصیب ہو کر دل روشن ہوتے ہیں اور یہ نور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن انسان پھر انسان ہے۔ نفس اور شیطان تاک میں ہیں جو پہلے تو اس نعمت سے دور رکھنے اور لذاتِ دنیا میں مصروف رکھنے میں لگے رہے مگر جب بندے کو احساس ہوتا ہے، وہ اِس طرف آتا ہے اور یہ دولت نصیب ہوتی ہے تو وہ بھی پہلو بدل لیتے ہیں اور پھر یہ گمان پیدا کرنے لگتے ہیں کہ اَب تم بہت پارسا ہو گئے ہو، تمہارا مقام بہت بلند ہو گیا ہے، تمہاری دُعا تو دُعا، تم جو کہہ دیتے ہو وہ

ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ باقی کمی عوام کالانعام پوری کر دیتے ہیں۔ جو ہاتھ چومنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی گھٹنے چھونے لگتے ہیں اور ہمہ وقت دعاؤں کے طالب اور ان کے بدلے روپیہ پیسہ نچھاور کرنے لگتے ہیں۔

اَب یہ معاملہ بہت نازک اور صرف اور صرف عظمتِ الٰہی کا تقاضا کرتا ہے اور لاشئ محض ہونے کے یقین پہ اس کی بنیاد ہے۔ جب بندہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونے کی طرف آنا چاہتا ہے، جس کا سبب نفس، شیطان اور عوام بنتے ہیں تو اِس پہاڑوں سے عظیم مگر شیشۂ دل سے نازک رشتے میں بال آجاتا ہے اور پھر راستہ قعرِ مذلت کی طرف بدل جاتا ہے۔ اللہ کریم اِس سے محفوظ رکھے۔ آمین

چنانچہ اِس کا دولت و سرمایہ یقین اور خلوص ہے۔ جو فقیر کے مطابق ایک ہی کیفیت کے دو نام ہیں۔ اگر یہ دولت نصیب ہو تو کیا ہوتا ہے؟ یہ صرف جانا جا سکتا ہے، بیان کرنا یا لکھنا ممکن نہیں۔ جسے شوق ہو وہ کر کے دیکھے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے اور بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسا طالب جسے لطائف خمسہ نصیب ہو جائیں دنیا و آخرت کے ہر شعبے میں کامیاب ثابت ہوتا ہے اور یہ کمال اللہ کے رسول ﷺ کا ہے کہ جن کی برکات کا پرتو لوہے کو کندن بنا دیتا ہے۔

ذرا حیاتِ طیبہ ﷺ پہ غور کیجیے تو بچپن سے یتیمی یعنی دنیاوی آسرا یا کوئی ظاہری سبب نہیں۔ پھر لڑکپن میں حضرت عبدالمطلب کی رحلت اور آپ ﷺ کا اپنے چچا ابو طالب کے زیرِ کفالت آنا، وہ آپ ﷺ کی مدد کیا فرماتے خود آپ ﷺ اُجرت پر بکریاں چراتے اور اُجرت اپنے چچا کو عطا فرماتے۔ پھر آپ ﷺ کی حضرت خدیجہ

رضی اللہ عنہا سے شادی ہوئی تو آپ ﷺ نے چچا سے فرمایا کہ ایک بیٹا مجھے دے دیں میں اس کی پرورش کروں اور آپ کا بوجھ بانٹ لوں۔ پھر اعلان نبوت پر روئے زمین کے کفر و شرک اور ظلم و جور کے مدمقابل صرف اللہ کریم کی مدد سے کھڑا ہو جانا اور پھر ہجرت فرمانا کہ قرآن کریم فرماتا ہے:

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ (النور:۵۴)

کہ میرے رسول کی ذمہ داری تو میرا پیغام پہنچانا ہے اور بس۔

مگر جوں جوں پیغام قبول ہوتا گیا۔ ان لوگوں کو آگے کی راہنمائی فرماتے گئے حتیٰ کہ ضرورت پیش آئی کہ اتنے لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے ہیں کہ اَب آزاد زمین اور آزاد ریاست کا وجود چاہیے تو مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ گھربار، دوست، رشتہ دار، مال و دولت، جاگیر جائیداد تمام مہاجرین نے قربان کی اور مدینہ منورہ جلوہ افروز ہوئے اور ایک آزاد ریاست کی ابتدا ہوئی۔ اور پھر مدینہ منورہ کے دس سال ایک جہدِ مسلسل ہیں یہ صرف اور صرف آپ ﷺ کی شان کو زیبا ہے کہ اِن دس سالوں میں صرف غزوات و سرایا کی تعداد اَسّی (۸۰) سے زیادہ ہے۔ پھر ریاست کے تمام امور، قوانین اور ضابطے اور ان پر عمل —— نہ صرف اس ریاست کے لیے بلکہ روئے زمین پر بسنے والوں کے لیے —— قیامت تک کے لیے ہمیشہ سند کا درجہ رکھتے ہوں۔ اور پھر پورا جزیرہ نمائے عرب کا ریاست میں شامل ہو کر قیصر و کسریٰ کے مقابل اور روئے زمین کے تمام ظالمانہ نظام کے مقابل، عادلانہ نظام کا اجراء۔

یہ محنت نہ تو وہ پیر سمجھ سکتا ہے جو مریدوں کی کمائی پہ پلتا ہے اور نہ وہ سیاستدان

جو آج نظام تو کیا بدلے گا اپنا حلیہ تک اسلامی نہیں بنا سکتا کہ کفر ناراض نہ ہو جائے۔

آپ ﷺ نے یہ امانت اُن جاں نثاروں کے سپرد فرمائی جو خود آپ ﷺ نے تیار فرمائے تھے اور انھوں نے ربع صدی میں روئے زمین پر نہ صرف پیغامِ حق کو عام کر دیا بلکہ ایک ایسی اسلامی ریاست بنا دی جو ہسپانیہ سے مغربی ہند اور چین تک اور روس سے افریقہ تک اسلامی نظامِ حکومت کی روشن مثال تھی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہ لطیفہ روشن ہو جائے تو سالک دنیاوی آسروں کا محتاج نہیں رہتا۔ دن رات دین کی عملی تعبیر کے لیے کوشاں اور ایک انقلاب آفرین ہستی بن جاتا ہے۔ نہ صرف خود دینِ حق پر عامل ہوتا ہے بلکہ ایک عالم کو اس سے برکات نصیب ہوتی ہیں اور لوگ عملاً دینِ حق پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعۃ: ۴)

ان پانچ لطائف کا نصیب ہونا بھی اللہ کریم کا بہت بڑا احسان اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے ایک نکاح کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لیے قصبہ لیٹی میں بلایا گیا۔ چونکہ متعلقہ خاتون سے بھی حقائق جاننا ضروری تھا لہٰذا جب خاتون سے تنہائی میں استفسار کرنا تھا تو میں نے کہا کہ کوئی ایک صالح اور عمر رسیدہ بندہ میرے ساتھ کر دو جس کے سامنے بات جان سکوں تو انھوں نے قاضی صاحب کو ساتھ بٹھا دیا۔ بات ہوئی۔ فیصلہ ہو گیا۔ جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو قاضی صاحب بھی ساتھ تھے کہ مجھے بس کے اڈے تک پہنچا کر آئیں۔ راستے میں کہنے لگے کہ حضرت اللہ، اللہ کرتا ہوں۔ دندہ شاہ بلاول والے حضرت صاحب، جو حضرت شاہ بلاول کی اولاد میں سے تھے، نے مجھے لطائف

پہ اسباق شروع کرائے۔ غالباً دو سال میں ایک لطیفہ کرواتے تھے۔ لہٰذا میں دس سالوں میں پانچ لطائف سیکھ سکا مگر الحمدللہ میرے پانچوں لطائف منور ہیں اور مسلسل محنت کرر ہا ہوں۔ مگر عالم یہ ہے کہ میری رہائش گاؤں سے باہر ڈیرے پر ہے۔ جب کبھی گاؤں جانا ہو اور اونچی جگہ سے گاؤں پر نظر پڑے تو لگتا ہے کہ گاؤں درندوں، سانپوں اور اژدھوں سے بھرا پڑا ہے۔''

حضرت رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ''میں سمجھ گیا کہ یہ تو مراقبۂ رویتِ اشکال ہے جو باقاعدہ کرایا جاتا ہے مگر اِن کے لطائف اِس قدر روشن ہیں کہ انھیں اس کی جھلک گاہے بگاہے نظر آجاتی ہے۔''

انسان گناہ کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کی روح کی شکل بدل کر حیوانی ہو جاتی ہے۔ اگر ایمان باقی رہے تو حلال جانور کی شکل ہوتی ہے مگر مسلسل گناہ سے اگر ایمان بھی ضائع ہو جائے تو پھر موذی جانوروں اور درندوں جیسی شکل ہو جاتی ہے۔ اور عموماً جس درندے یا جانور سے عادات کی مشابہت ہو ویسی ہی شکل بنتی ہے۔ بظاہر وجود تو انسانی رہتا ہے مگر کردار ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے کہ ''جب میں نے بات سمجھائی (اور طالب کو بھی کمال درجے کا پایا) تو قاضی صاحب عرض کرنے لگے کہ میرے حضرت کا وصال ہو گیا مگر وہ مجھے بتایا کرتے تھے کہ لطائف سات ہیں۔ کاش! کوئی ایسا اللہ کا بندہ مل جاتا جو مجھے سات لطائف تو کرا دیتا۔'' حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا، ''قاضی صاحب! اگر میں ہی وہ بندہ بن جاؤں تو؟''

حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کی شہرت عالمِ دین، مفتی اور مناظر کی تھی اور کہاں

مناظر اور کجا تصوف ! تو قاضی صاحب کو بہت حیرت ہوئی اور فوراً دامن سے وابستہ ہو گئے۔ قاضی صاحب کے شیخ کے منازل فنا، بقا سے آگے سالک المجذ وبی تک تھے جو بہت اعلیٰ منازل تھے۔ لیکن قاضی صاحب جس چشمۂ فیض سے وابستہ ہوئے —— بحمد للہ —— فنا، بقا، سالک المجذ وبی، عرش حتیٰ کہ نو عرشوں سے بالا، عالمِ امر کے کتنے ہی دوائر کو طے کرتے ہوئے انتہائی بلند منازل پہ ان کا وصال ہوا۔ جو صدیوں میں گنتی کے حضرات کو نصیب ہوتے ہیں۔

یہاں آج کے طالب یوں نہ سوچیں کہ ہمیں تو ایک ہی نشست میں ساتوں لطائف کرا دیے گئے مگر یہ احوال تو نصیب نہیں۔ گذارش ہے کہ احوال کا مدار مجاہدے پر ہے۔ اوّل —— اکلِ حلال، دوم —— صدقِ مقال اور سوم —— ذکرِ دوام۔ بھلا کوئی کر کے دیکھے تو پتہ چلے۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں شاید چوبیس منٹ بھی ذکر کو دے نہیں پاتے تو کیفیات کیا خاک ہوں گی۔ ہاں یہ مقامِ شکر ہے کہ کم اَز کم عقیدہ تو درست رہتا ہے اور ایمان قائم۔ مگر اِس پہ مجاہدہ ضرور کرنا چاہیے کہ یہی وقت جسے ہم محض دنیا کمانے میں صرف کر رہے ہیں، آخرت کمانے کا بھی ہے۔ اللہ کریم توفیق ارزاں فرمائے۔ آمین

آپ ﷺ کے معجزات کا شمار ہو سکتا ہے نہ برکات کا۔ مگر ایک بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ عند اللہ ایک جذبہ مطلوب و محبوب ہے اور وہ ہے محبت۔ محبت بظاہر ایک بہت عام سا لفظ ہے اور بات بات پہ استعمال ہوتا ہے لیکن دیکھا جائے تو بہت کم یاب ہے۔ لوگ ذاتی مفادات کے لیے جو تعلقات بناتے ہیں عموماً

انھیں محبت کا نام دیتے ہیں۔ مثلاً اولاد سے محبت ہے لیکن اگر اولاد کما کر نہ دے تو محبت کافور ہو جاتی ہے۔ اگر والدین اور اولاد کی محبت کا یہ حال ہے تو باقی محبتوں کی بحث فضول ہے۔ ہاں اگر کہیں واقعی کوئی ذرہ محبت کا ہو تو وہاں محبت کرنے والا اپنا نہیں محبوب کا خیال رکھتا ہے اور ہر حال میں اُس کی خوشنودی کا طلب گار رہتا ہے۔

فان المحب لمن یحب مطیع ''محبت کرنے والا محبوب کا غلام ہو جاتا ہے۔''

اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو محبوب کی رضا پر قربان کر دیتا ہے۔ اگرچہ نجات کے لیے ایمان واطاعت کافی ہے مگر قربِ ذات کے لیے محبت شرط ہے اور اس کا راستہ بھی اطاعت ہے۔

اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران:۳۱)

کا ارشاد کافی ہے کہ خلوصِ دل سے اطاعتِ رسول ﷺ محبتِ الٰہی پیدا کرتی ہے۔

محبت ایک کیفیت کا نام ہے اور کیفیات دیکھنے، سننے، جاننے سے پیدا ہوتی ہیں مگر اللہ جل جلالہ کی ذات علومِ انسانی سے بہت بلند ہے تو جب انسان کے علوم کی رسائی ہی نہیں تو محبت کیسے ہوگی؟ فرمایا:

تم میرا اتباع کرو گے تو اللہ جل جلالہ تم سے محبت کرے گا اور محبتِ الٰہی کے جواب میں تمہارے دل میں بھی اللہ کریم سے محبت پیدا ہو جائے گی جو مطلوب ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط (البقرۃ:۱۶۵)

کہ مومنین اللہ جل جلالہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔

یہ تو ایک راستہ ہے۔ دوسرا راستہ ہے آپ ﷺ سے دلی محبت۔ جو تعلق سے

پیدا ہوتی ہے اور نبی سے ایسا تعلق جو صرف خلوصِ قلبی پہ منحصر ہو، بغیر کسی ذاتی خواہش کے، وہ محبت کا طوفان پیدا کردیتا ہے۔ انسان تو پھر انسان ہے، سینے میں دل رکھتا ہے مسجدِ نبوی کا ستون جس سے حضور ﷺ ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے اُس کا تعلق تو محض وجودِ اقدس سے مَس ہونے کا تھا مگر اُس جسم اطہر کے ساتھ مَس ہونے نے اس میں اِس قدر جذباتِ محبت بھر دیے کہ جب آپ ﷺ کے لیے منبر بنا اور حضور ﷺ اس پر تشریف فرما ہوئے تو ستون چند منٹ کی دُوری برداشت نہ کرسکا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

اُستنِ حنانہ در ہجرِ رسول

نالہ ہائی زد چوں اصحابِ عقول

حنانہ ستون کا نام تھا تو فرمایا حنانہ ستون فراقِ رسول ﷺ میں زندہ انسانوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ آپ ﷺ نے دست مبارک پھیرا، تسلی دی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ایک دم سے چپ نہ ہوا بلکہ جیسے روتا ہوا بچہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لیتے ہوئے خاموش ہوتا ہے، چپ ہوا۔ خشک لکڑی تھی، لکڑی ہی رہی مگر دردِ محبت سے لبریز ہوگئی۔ انسان تو مکلّف مخلوق ہے اور استعداد رکھتا ہے۔ اگر واقعی دامنِ پاک سے وابستہ ہوجائے تو کس قدر درد سمیٹے گا۔

سالک کو پانچویں لطیفہ سے ان سب نعمتوں سے حصہ ملتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ شیخ کامل ہو جو توجہ دے سکے۔ اور سالک خلوص اور صدق دل سے توجہ قبول کرے۔ پھر وہ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا مصداق بن جاتا ہے۔ اور یہ ربِّ جلیل کا عظیم احسان ہے۔

# چھٹا لطیفہ، نفس

اِس کا مقام پیشانی میں ہے جو سجدہ کرتے ہوئے زمین پر رکھی جاتی ہے۔
انسانی وجود مٹی، آگ، ہوا اور پانی سے بنایا گیا ہے۔ ان عناصرِ اربعہ سے نفس پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ مادیات کے ملنے سے اس کی تخلیق ہوتی ہے لہٰذا بنیادی طور پر یہ لذاتِ مادی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اگر ایمان نصیب ہو تو روح میں حیات پیدا ہوتی ہے اور جس قدر رُوح میں قوت آتی جائے نفس کی حالت تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ ایمان کے لیے عمل اور عمل کے لیے خلوص اور اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم ضروری ہے۔ اِس سے قوتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے اور جوں جوں قوتِ ایمانی ترقی پاتی ہے نفس کی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے۔ قرآن نے اِس کی تین صورتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

پہلی ـــ نفسِ امّارہ ـــ جو دِین و ایمان اور نیکی بدی کے تصوّر سے بے نیاز محض لذاتِ دنیوی میں کھو جاتا ہے اور جائز، ناجائز کی پرواہ کیے بغیر حصولِ لذات اور حصولِ زر کو مقصد بنالیتا ہے۔ یہ عموماً حالتِ کفر میں ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ ــــ نفس لوّامہ ہے کہ جب ایمان نصیب ہوتا ہے تو نیکی بدی کا تصور بھی ملتا ہے اور نفس نیکی کی کوشش کرتا ہے مگر اپنی خاصیت کی بنا پر برائی بھی کر گزرتا ہے لیکن پھر اِسے برائی کا احساس ہوتا ہے خود کو ملامت کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے۔

اَب یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کافر بھی بعض کام نیک کرتے ہیں مثلاً ہسپتال یا تالاب وغیرہ بنا دیتے ہیں یا کسی کی مدد کر دیتے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ نہ تو ان کا اللہ ﷻ پر ایمان ہوتا ہے نہ رسول پر اور نہ ہی آخرت پہ یقین تو اگر بظاہر نیکی بھی کرتے ہیں تو مقصد دنیا کا حصول ہی ہوتا ہے۔ مالی فائدہ یا شہرت وغیرہ۔ یا بعض اوقات یہ بھی سوچتے ہیں کہ ایسا کرنے سے کوئی دنیا کی مصیبت ٹل جائے گی۔ لہٰذا وہ نیکی جان کر نہیں کرتے کہ ان کا نفس اَمّارہ ہوتا ہے۔ انسان کو ایمان نصیب ہو اور وہ صرف مردم شماری کا مسلمان نہ ہو تو یقیناً نیکی اور بدی میں تمیز کر سکتا ہے۔ وہ نیکی اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم جان کر اور آخرت کے لیے کرتا ہے اور اگر اس سے برائی سرزد ہو جائے تو اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور اسے اُس پر ندامت ہوتی ہے۔ یہی ندامت توبہ کہلاتی ہے جو آئندہ برائی سے بچنے کا سبب بنتی ہے۔

تیسرا درجہ ــــ نفسِ مطمئنہ ــــ ایمان و اطاعت اور اتباع کے ساتھ خلوص نصیب ہوتا ہے تو نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ یعنی گناہ سے ڈرتا ہے اور نیکی کی طرف رغبت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ عبادات و تلاوت میں کثرت نصیب ہوتی ہے اور انسان عملی زندگی میں پورے جوش و جذبہ سے مصروفِ عمل ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف خود نیکی کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہزاروں بھٹکے ہوئے لوگ بھی راہِ ہدایت پاتے، توبہ کرتے اور

نیکی کی طرف گامزن ہو جاتے ہیں اور یہی مقصودِ حیات ہے۔

ایک غلط فہمی کہ ولی اللہ تو تارک الدنیا ہوتے ہیں اور جنگلوں میں رہتے ہیں، کوئی کاروبار نہیں کرتے۔ یہ درست نہیں۔ دراصل چند خاص، بہت اعلیٰ پائے کے اولیاء اللہ کے پاس لوگوں کا جمِ غفیر دیکھ کر حکمرانوں نے انھیں شہروں سے نکال دیا اور ان سے ملاقات منع کر دی۔ ان میں بہت بڑے نام آتے ہیں مثلاً حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ لیکن لوگوں نے ہر بے کار اور پاگل کو ولی سمجھنا شروع کر دیا۔ ورنہ اولیاء اور صوفیاء زندگی میں جتنا کام کرتے ہیں دوسرے لوگ نہیں کر سکتے کہ اُن کی ہمت، قوتِ کار اور کام میں برکات شامل ہوتی ہیں اور یہ برکات نبی کریم ﷺ سے تقسیم ہو کر سینہ بہ سینہ پہنچی ہیں۔ آپ ﷺ سے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے تابعین، تابعین سے تبع تابعین اور یوں مشائخ عظام تک پہنچتی ہیں اور ان کے قلوب سے طالبانِ حق کے قلوب تک پہنچتی ہیں۔

اِس لطیفہ پر تجلیاتِ باری ہوتی ہیں جو کبھی تو دو عالم کو روشن کر دیتی ہیں اور کبھی کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ ان کی کیفیات اور کمیت کو بتانا، بیان کرنا یا لکھنا ممکن نہیں۔ جنھیں نصیب ہوتی ہیں وہی محسوس کر سکتے ہیں۔ ہاں ان کا جو اثر عملی زندگی پر آتا ہے وہ یہ ہے کہ نافرمانی کی تلخی محسوس ہونے لگتی ہے اور اگر بتقاضائے بشریت خطا ہو جائے تو سخت ندامت ہوتی ہے اور نیکی مرغوب و مطلوب بن جاتی ہے کہ اللہ کریم نے انسان پر بہت بڑا احسان یہ فرمایا کہ یہ جانوروں کی طرح عادات کا پابند نہیں بلکہ قلبی پسند و ناپسند کے مطابق عادات واطوار میں تبدیلی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب قلب کو

انوارات نصیب ہوتے ہیں اور قربِ الٰہی کی لازوال لذت سے شناسائی نصیب ہوتی ہے تو پسند، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند میں فنا ہو جاتی ہے۔ اور جب قلبی پسند میں یہ تبدیلی آتی ہے تو اطوار و اعمال میں بہت خوب صورت تبدیلی آجاتی ہے۔ اگرچہ وہ فرشتہ نہیں بن سکتا کہ انسان ہے اور نہ معصوم عن الخطا ہوتا ہے کہ عصمت خاصۂ نبوت ہے اور معصوم عن الخطا صرف نبی ہوتا ہے ہاں اِن برکات سے محفوظ عن الخطا ہو جاتا ہے کہ گناہ سے بچنے کے لیے اسے حفاظتِ الٰہیہ نصیب ہو جاتی ہے اور ہمہ وقت رجوع الی اللہ اور تعمیرِ آخرت کی فکر میں رہتا ہے یوں دُنیا و آخرت کی کامیابی نصیب ہوتی ہے اور یہ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے۔ یاد رہے کہ انسان کو تمام علوم خواہ وہ دنیا کے ہوں یا آخرت کے انبیاء کرام علیہم السلام ہی سے نصیب ہوئے۔ لہٰذا اِن انوارات سے نہ صرف علمی استعداد نصیب ہوتی ہے بلکہ علوم کے خزانے بھی نصیب ہوتے ہیں۔ دراصل آخرت کی کامیابی کا مدار بھی تو ایمان کے ساتھ امورِ دنیا کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے سے انجام دینے پر ہے اور نفسِ لوّامہ اسی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔ پھر عطائے باری سے اگر وہ نفسِ مطمئنہ کا درجہ پالے تو سبحان اللہ! دو عالم سدھر جاتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں ایسے لوگ۔ دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کریم یہ دولت ہر مسلمان کو نصیب فرمائے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ سوچا جاتا ہے کہ اولیاء اللہ کوئی اور قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ حالانکہ کتاب اللہ کے مطابق ہر مومن کو ایک درجہ ولایت کا نصیب ہوتا ہے اور بنیادی طور پر ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔

ارشاد ہے:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (البقرۃ:۲۵۷)

کہ اللہ ہر مومن کا ولی ہوتا ہے۔

اب مجاہدہ اور نیکی اسے مزید روشن کرنے کا سبب بنتی ہے اور کچھ لوگ ان عظمتوں کو پا لیتے ہیں کہ ہزاروں نفوس کو روشن کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ بے شک ان کا مقام بہت عالی ہے مگر بنیادی طور پر تو ہر ایمان لانے والے کو یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ پھر کچھ بد بخت اپنی بداعمالیوں سے اسے ضائع کر بیٹھتے ہیں مگر یاد رہے! جب یہ وصف نہیں رہتا تو ایمان بھی نہیں بچتا اور ایسے لوگ کسی نہ کسی فرقہ ضالہ میں شامل ہو کر ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اللہ کریم ایسی صورتحال سے اپنی پناہ میں رکھے۔ آمین

چونکہ اس لطیفے پر تجلیات باری ہوتیں ہیں لہٰذا ان کا نہ رنگ متعین ہو سکتا ہے نہ کیفیت کہ ایک نور رہتا ہے جو کبھی ہر شے اور ہر طرف کو روشن کر دیتا ہے اور کبھی کوئی خبر بھی نہیں آتی۔ ہاں روشنی اور گرمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلۂ بے شرمی است

"کہ مرد یعنی شیخ اگر حقیقی ہو تو روشنی اور گرمی نصیب ہوتی ہے اور اگر شیخ ہی کامل نہ ہو تو کیفیت تو کیا ہو گی بس حیلوں بہانوں اور بے شرمی سے صرف باتیں بناتا رہتا ہے۔"

# ساتواں لطیفہ، سلطان الاذکار

اس میں سارا وجود ذاکر ہوجاتا ہے۔ اس لطیفہ پر بھی تجلیات باری ہوتی ہیں۔ جو بے رنگ و بے کیف ہوتی ہیں۔ سالک محسوس تو کرتا ہے مگر کیفیات کو بیان کرنے کے لیے کوئی الفاظ بنے ہی نہیں کہ یہ بیان ہو ہی نہیں سکتیں۔ ہاں یہ بات ہے کہ جسم کا ذرہ ذرہ روشن ہوکر ذاکر ہوجاتا ہے۔ جدید سائنس کے مطابق انسانی وجود میں اڑھائی کھرب سیل ہوتے ہیں۔ گویا اس دنیا سے کروڑوں گنا بڑی دنیا ہر انسانی وجود میں آباد ہے اور کوئی سیل چھ ماہ سے زیادہ نہیں رہتا۔ ہر سیل اپنے جیسا دوسرا سیل پیدا کر کے مر جاتا ہے۔ لہٰذا انسان جہاں جاتا ہے، جدھر سے گزرتا ہے، جو لباس پہنتا ہے، جس بستر پہ سوتا ہے، ہر جگہ مردہ سیل گرتے رہتے ہیں اور ہر وجود چھ ماہ میں مادی طور پر بالکل نیا وجود بن جاتا ہے۔ یہ سلسلہ موت تک مسلسل جاری رہتا ہے کہ شب و روز میں ہر انسان کے اندر کروڑوں موتیں ہوتی ہیں اور کروڑوں نئے سیل تخلیق ہوتے ہیں۔ پھر اگر نئے بننے والے سیل میں کوئی کمی ہو تو دماغ سے بجلی کی لہر جاتی ہے جو اسے درست کر دیتی ہے۔

اِس کے ساتھ سائنسدان یہ کہتا ہے کہ ہر سیل میں ایک کتاب ہے جس میں اس شخص کی پوری زندگی کی تفصیل درج ہے۔ یہاں تک کہ کب پہلا بال سفید ہوگا یا کب ایک دانت خراب ہوگا۔ یہ سب پڑھا جاسکتا ہے۔ سبحان اللہ! اس قادر قیوم کی قدرت دیکھیں سچ فرمایا اس نے:

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (ق:١٦)

کہ میں انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہوں۔

شہ رگ بھی تو سیلوں (Cells) سے بنتی ہے اور وہ قادر مطلق ہر آن، ہر وجود میں کروڑوں سیلوں (Cells) کو موت وحیات دے رہا ہے۔ وہ ذات تو اس سے بہت ہی زیادہ قریب تر ہے۔

چنانچہ جب اس لطیفہ پر ذکر نصیب ہوتا ہے تو وجود کا ہر سیل ذاکر ہوجاتا ہے اور ایسا شخص ایک بار اَللّٰہ کہتا ہے تو وجود کا ہر سیل ساتھ اَللّٰہ کہتا ہے۔ یوں ہر سیل کے ساتھ نور کی ایک تار جڑ جاتی ہے۔ اندازہ کیجیے! کتنی بھی باریک ہو مگر نور کی اڑھائی کھرب یعنی دوسو پچاس کروڑ تاریں ایک وجودِ انسانی اور عرشِ الٰہی کے درمیان روشن ہوجاتی ہیں۔ غالباً ایسے ہی لوگوں کے لیے کتاب اللہ میں موجود ہے۔

نُوۡرُهُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ (التحریم:٨)

کہ پل صراط کو چلیں گے تو ان کے آگے پیچھے ہر طرف نور رقصاں ہوگا۔ تو اُس وقت محروم لوگ ان سے کہیں گے کہ کچھ روشنی ہمیں بھی دے دو تو وہ فرمائیں گے یہ یہاں تو نہیں مل سکتی۔ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے۔ ہاں اگر کر سکتے ہو تو واپس دنیا میں جاؤ

وہاں ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ مگر افسوس تب تک دنیا ختم ہوچکی ہوگی اور انھیں سوائے حسرت کے کچھ نصیب نہ ہوگا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں اِس دارِ دُنیا میں کوئی ایسی ہستی مل جائے جو لطائف روشن کردے تو یہ اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے۔

تو یوں ساتویں لطیفے — سلطان الاذکار — کے ساتھ سارا وجود بلکہ وجود کا ہر ذرہ ذاکر ہوجاتا ہے اور روئیں روئیں سے اللہ، اللہ خارج ہونے لگتا ہے۔ اِس کا بہت بڑا اثر عملی زندگی پر پڑتا ہے۔

اوّل۔ ایمان ویقین میں بہت زیادہ پختگی نصیب ہوتی ہے۔

دوم۔ استعدادِ کار بہت بڑھ جاتی ہے اور ایسا بندہ اتنا کام کر جاتا ہے جتنا کئی لوگ مل کر نہیں کر سکتے۔

نیز شعور کو جِلا ملتی ہے اور کام کرنے کا سلیقہ بھی نصیب ہوتا ہے اور بفضل اللہ، اللہ کی نافرمانی سے بچنے کی توفیق نصیب ہوتی ہے اور اگر کوئی خطا ہوجائے تو انوارات میں کمی آجاتی ہے جو توبہ کی طرف راغب کرتی ہے اور پھر مزید محنت ومجاہدہ سے اور شیخ کی توجہ سے جا کر معاملات درست ہوتے ہیں۔

شیخ کی توجہ دراصل برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پرتو ہوتی ہے اور اتنا کام کرتی ہے جتنا شاید صدیوں کی محنت نہ کر سکے۔

یوں یہ سات لطیفے ایک بہت بڑا خزانہ بن جاتے ہیں۔ اِن پر مشائخ چودہ، چودہ سال محنت کروایا کرتے تھے۔ یہ بات حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ نے آسان فرمادی کہ ایک توجہ میں سات لطائف کرادیا کرتے تھے۔ اور یہ بہت عجیب بات ہے۔ لیکن

ایک بات یاد رہے! کہ محنت مجاہدہ کی ضرورت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے کہ مجاہدے کے بغیر بات نہیں بنتی۔ جن خوش نصیبوں کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے وہ پورے خلوص سے بھرپور محنت بھی کرتے ہیں۔ یہ سب اذکار مل کر صحتِ عقیدہ اور حسنِ عمل کا سبب بنتے ہیں اور یہی مقصود ہے کہ عقیدہ درست ہو اور اعمال کی اصلاح ہو جائے تو اللہ کریم کا بہت بڑا احسان ہے۔

# طریقۂ ذِکر

# سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ

لطائف کی یہ ترتیب سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اویسیہ کے مطابق بیان کی گئی ہے
کہ بعض دوسرے سلاسل میں لطائف کی تعداد میں بھی فرق ہے اور مقاماتِ لطائف
بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔
نیز بنیادی پانچ لطائف میں کہیں بھی اختلاف نہیں جبکہ اگلے یوں بھی ان کی تفسیر وتعبیر
ہیں لہٰذا اس میں اختلاف کا حرج نہیں۔ بہرحال یہاں مقصود طریقۂ ذکر کا بیان ہے۔

یوں تو ایمان لانا بجائے خود ایک عمل ہے اور اس سے اللہ ﷻ کی یاد وابستہ
ہے لہٰذا وہ بھی ذکر ہے۔ ائمہ فقہ کی اکثریت اعمال کو ایمان قرار دیتی ہے اور کتاب اللہ
میں بھی جہاں ایمان کا ذکر ملتا ہے ساتھ عملِ صالح ارشاد ہوتا ہے تو اکثر ائمہ فقہ فرماتے
ہیں کہ بے عمل کے ایمان کا اعتبار نہیں مثلاً تارکِ صلوٰۃ کا جنازہ نہ پڑھا جائے یا
مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔ اول اُسے قید کیا جائے اور اگر تلقین پر بھی
صلوٰۃ ادا نہیں کرتا تو گردن ماردی جائے۔ مگر امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ
قید کیا جائے، قتل نہ کیا جائے کہ کلمہ پڑھنا اور ایمان لانا بھی تو ایک عمل ہے۔ ہاں اگر

صلوٰۃ کی ادائیگی سے محروم مرجائے تو پھر بے شک نہ جنازہ پڑھایا جائے گا اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوگا۔

تو یہ ایمان لانا بھی ذکر ہے۔ پھر اس کے بعد ہر وہ عمل جو قرآن وسنت کے مطابق ہوگا وہ عملاً ذکر ہے۔ آپ بے شک اُسے عملی ذکر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد ذکرِ لسانی ہے یعنی زبانی ذکر۔ اس میں ہر نیک جملہ یا نیک لفظ جو زبان سے نکلے گا وہ ذکر ہے۔ پھر تلاوت وتسبیحات وغیرہ ذٰلک، سب ذکرِ الٰہی میں داخل ہو کر باعثِ ثواب تو بنتی ہیں لیکن حیاتِ قلبی میں وہ سوز اور وہ نمو پیدا نہیں کرسکتیں جو مطلوب ہے۔ لٰہذا پھر سب کو ذکرِ قلبی ہی کی طرف آنا ہوتا ہے مثلاً اکثر سلاسل میں ذکرِ جہر یعنی آواز کے ساتھ ذکر شروع کرتے ہیں۔ پہلے لاالہ الااللہ۔ کچھ دیر بعد صرف الااللہ۔ کچھ دیر بعد صرف اللہ، اللہ۔ لیکن پھر کچھ دیر بعد خاموش ہو کر قلب کی طرف متوجہ ہو کر اللہ، اللہ۔ کیونکہ مقصد قلب کو حیات بہم پہنچانا ہے۔

مگر یاد رہے! اس کا اصل سبب برکاتِ نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ جو صحابہ کرامؓ کو ایک نگاہ میں میسر اور نصیب ہوگئیں مگر اِس کے باوجود مسجدِ نبوی میں صحابہ کرامؓ کا حلقۂ ذکر ثابت ہے۔ بلکہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (الکہف:۲۸)

تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تشریف لائے تو کچھ لوگ بیٹھے ذکر کررہے تھے اور کچھ دوسرے صحابہ فقہی موضوع پر بات کررہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حلقۂ ذکر والوں میں تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اللہ جل جلالہ کا شکر ہے کہ مجھے جیسے لوگوں کے ساتھ رہنے کا

ارشاد فرمایا ہے ویسے لوگ بھی مہیا فرما دیے۔

اِسی طرح تابعین کو برکاتِ نبوت صحابہ کرامؓ کی مجلس سے نصیب ہو گئیں مگر وہ ذکر اور مجاہدہ ضرور کرتے تھے۔ تبع تابعین کو تابعین سے یہ برکات حاصل ہوئیں۔ اس کے بعد یہ قوت نہ رہی کہ محض مجلس سے برکات نصیب ہو جائیں۔ اس کے لیے مشائخ کو توجہ کرنا اور طالب کو متوجہ ہو کر ذاکر ہونا اور دل کو صاف کرنا کہ وہ برکات قبول کر سکے، لازم ٹھہرا اور جس طرح دوسرے ادارے وجود میں آئے، تفسیر کے لیے یا حدیث اور فقہ کے لیے، اسی طرح حصولِ برکات کے لیے جو ادارہ بنا اُسے سلسلہ کہا گیا۔ یوں بہت سے سلاسل کا تذکرہ ملتا ہے لیکن یہاں اس تفصیل کی ضرورت نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ طویل طریقہ ہائے ذکر، ارتکاز توجہ یعنی خود اپنی توجہ کو ایک جگہ قائم رکھنے کے لیے شروع کیے گئے کہ یکسوئی ہو گی تو برکات وصول کر سکے گا اور شیخِ کامل کی ضرورت تو بنیاد ہے کہ وہ توجہ دے گا تو قلب قبول کر سکے گا لہٰذا سلاسل تصوف وجود میں آئے اور مفسرین، محدثین اور فقہائے کرام سب نے اس سے فیض پایا کہ یہ سب لوگ ذاکر اور روشن قلوب رکھنے والے تھے۔ یوں تو اکثر سلاسل میں ذِکر کے یہ طویل طریقے ملتے ہیں مگر طریقِ اویسیہ ایک الگ نسبت ہے۔ اویس قرنی رحمتہ اللہ علیہ اس سلسلہ کے مشائخ میں شامل نہیں ہیں۔ صرف طریقہ وہ ہے جو انھیں نصیب تھا یعنی وجودِ مادی دور بھی ہو تو روح فیض یاب ہو سکے۔ یہ کمال، اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل تھا کہ ہر حال میں انھیں نسبتِ روحانی نصیب تھی۔ اسی لیے یہ نسبت انھیں سے چلتی ہے اور یہ واحد نسبت ہے جو ان کی ذات سے تقسیم ہوتی ہے۔

باقی تمام سلاسل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع ہوتے ہیں کہ برکاتِ نبوت تمام خلفائے راشدین کو نصیب ہو کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، جو خلفاءِ اربعہ میں آخر تھے، آگے تقسیم ہونا شروع ہوئیں مگر یہ نسبت (نسبتِ اویسیہ) اگرچہ تمام خلفائے راشدین کو ضرور حاصل تھی لیکن اس کی تقسیم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع ہوتی ہے اور یوں اس میں جسمانی طور پر حاضری ضروری نہیں بلکہ رُوح، رُوح سے فیض حاصل کرسکتی ہے۔ دیگر تمام سلاسل میں حضرات کی خدمت میں حاضری ضروری ہے کہ ہر مراقبہ و مقام خدمت میں حاضر ہو کر توجہ لینے سے نصیب ہوتا ہے مگر نسبتِ اویسیہ میں ایک دفعہ رابطہ شیخ سے ہو جائے اور حصولِ برکات شروع ہو جائے تو طالب، دُنیا میں جہاں بھی ہو، برکاتِ روحانی نصیب ہوتی رہتی ہیں۔ اور ایک خاص مقام سے آگے تو پھر مراقبات، دور رہ کر بھی نصیب ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ حضوری میں جو برکات نصیب ہوتی ہیں ان کی بات پھر بھی الگ ہے۔

سلسلۂ عالیہ کا طریقۂ ذکر بھی خاص ہے۔ بزرگانِ دین نے بہت سے طریقے لکھے ہیں۔ ان کی کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں ایک طریقہ پاسِ انفاس کا ہے۔ یعنی ہر سانس کا پاس رکھنا۔ ہر سانس کی نگرانی کرنا۔

طریقہ اس کا یہ ہے کہ بہت اچھی بات ہے۔ بندہ باوضو ہو، جگہ پرسکون ہو، شور شرابا نہ ہو، قبلہ رو ہو کر بیٹھے، آنکھیں بند کرلے، منہ بند رکھے اور متوجہ الی اللہ ہو کر ذکر پاسِ انفاس شروع کردے کہ جب سانس اندر جائے تو خیال کرے کہ لفظ اَللّٰہُ، سانس کے ساتھ اندر جارہا ہے اور جب خارج ہو تو نہ صرف 'ھُوْ' خارج ہو، بلکہ 'ھُوْ' کی

ضربِ قلب پر یعنی پہلے لطیفے پر لگے۔ ابتداءً شیخ کی اجازت سے، اس کی توجہ کے تحت کیا جائے گا۔ جتنا ممکن ہو، آسانی سے کر سکے تو تیز تیز اور قوت سے کرے تو لطیفہ روشن ہونا شروع ہو جائے گا کہ اصل شے تو شیخ کی توجہ ہے جو دراصل برکاتِ نبوی ﷺ ہیں اور سینہ بہ سینہ شیخ کے قلب تک پہنچ کر طالب کے قلب کو سیراب کر رہی ہیں۔ یہ معمولی بات نہیں کہ قلب کو روشن کر لیا جائے۔ اس کے لیے وقت بھی درکار ہے اور محنت بھی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ بزرگانِ دین اور مشائخِ عظام اِس پر دو، دو سال محنت کرایا کرتے تھے تب جا کر بات بنتی تھی۔ اِس کے اثرات اگر کشفاً معلوم نہ بھی ہوں تو عملی زندگی میں آنا شروع ہو جاتے ہیں اور نیکی کا سفر شروع ہو جاتا ہے جیسے ارشاد ہے:

يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرۃ:۲۵۷)

کہ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے۔

رہی بات کشف اور مشاہدہ کی تو اول تو کشف از قسمِ ثمرات ہے اور ثمرات من جانب اللہ ہوتے ہیں اور وہبی چیز ہیں یعنی اللہ کریم اپنی مرضی سے عطا کرتے ہیں اور ضروری بھی نہیں کہ جب یہ مجاہدے کا ثمر ٹھہرے تو یقیناً اجر و ثواب کا درجہ رکھتے ہیں تو اُتنا اجر، آخرت کے اجر سے کم ہو جائے گا۔

حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بڑے بڑے صاحب کشف حشر کو حسرت سے کہیں گے کہ کاش انھیں دنیا میں کشف نہ ہوتا تو آج اجر و ثواب کا سبب بنتا۔ بہرحال اگر نصیب ہو تو اللہ کریم کا انعام ہے۔ ہاں جو اثرات عملی زندگی پر پڑنا چاہئیں وہ ضروری اور مطلوب ہیں۔ جیسا کہ پہلے آدم علیہ السلام کی خصوصیات کا

اجمالی تذکرہ ہو چکا۔ وہ چیزیں طالب کی حیثیت، شعور، استعداد اور مجاہدے کے مطابق عملی زندگی میں داخل ہونا چاہئیں۔خود طالب ان باتوں پہ توجہ دے اور دیکھے کہ اس نے کیا پایا؟ کہ اسی سے رجوع الی اللہ، توبہ، تحمل اور جدوجہد کی استعداد پیدا ہوتی ہے۔ جتنا وقت دے سکے، دے پھر دوسرے لطیفے پر جائے۔ وقت کی یہ تقسیم اس بات پر منحصر ہے کہ اسے لطائف کو کتنا وقت دینا ہے۔لہذا ایک لطیفے کو کتنا وقت دے گا؟ یہ تو اللہ کی دی ہوئی توفیق ہے۔ فقیر کا جب لطائف پر سبق تھا تو گھنٹوں وقت لگایا کرتا تھا۔ سردیوں میں عموماً رات دو بجے سے صبح چھ بجے تک سات لطیفے کیا کرتا تھا۔ مغرب کا معمول اس کے علاوہ تھا کہ یہ سب توفیق کی بات ہے۔ اللہ کریم مہربانی فرمائے تو زیادہ سے زیادہ وقت لگایا جائے۔

دوسرے لطیفے پر سانس ویسے ہی چلتا رہے۔ لفظ 'اللہ' دل کی گہرائی تک جائے اور 'ھُو' کی ضرب دوسرے لطیفے پر لگے۔ اور یوں سانس کی آمد و رفت اور اس کی نگرانی بدستور رہے۔ انوارات نظر آئیں تو بہت اچھا مگر ضروری نہیں۔ ہاں برکات جو اس لطیفے سے بیان کی جاچکی ہیں، ان میں سے جو نصیب ہو اس کا خیال رکھنا اور اپنی عملی زندگی پہ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس پر حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی برکات ہوتی ہیں تو عملی زندگی میں ان کے اثرات کا آنا انعامِ الٰہی ہے۔ ہر فرد پر ایک سطح کے اثرات نہیں آسکتے۔ ہر آدمی کا مزاج الگ، یقین و ایمان کی گہرائی الگ، اللہ کریم کے ساتھ تعلق اور نسبت کا معیار اپنا اپنا تو اِس وجہ سے کم، زیادہ تو ہو سکتے ہیں مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی نتیجہ ہی نہ ہو۔

اِسی طرح پھر سانس توڑے بغیر توجہ کو تیسرے لطیفے پر لے جائیں۔ اَللّٰہُ دل کے اندر جائے اور جب سانس خارج ہو تو 'ہُو' کی ضرب تیسرے لطیفے پر لگے۔ اِس پر جیسا کہ عرض کیا جا چکا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فیض ہوتا ہے۔ انوارات کا رنگ سفید ہوتا ہے اور مزاج اور عمل میں برکاتِ موسوی کا اثر آتا ہے جو اللہ کی عطا اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق نصیب ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں سخت مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِن سب کی اصل تو شیخ کی توجہ ہے مگر شیخ کی توجہ تو سورج کی شعاعوں کی مانند ہے جو درخت پر بھی پڑتی ہیں اور زمین پر بھی، پتھر پر بھی پڑتی ہیں اور شیشہ پر بھی لیکن ہر جگہ نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ دل کو شیشہ بنایا جائے تو بات بنتی ہے۔ عقیدہ اور عمل درست ہو، شیخ کامل نصیب ہو اور محنت کی توفیق ارزاں ہو، تب جا کر ان نعمتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تیسرے کے بعد چوتھا لطیفہ ہے۔ اِسی طرح ذکر جاری رکھیں۔ سانس نہ ٹوٹے۔ صرف توجہ چوتھے لطیفے پر لے جائیں۔ 'اَللّٰہُ' دل میں اُترے اور 'ہُو' کی ضرب چوتھے لطیفے پر لگے۔ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فیض ہوتا ہے۔ انوارات کا رنگ گہرا نیلا ہوتا ہے اور انوارات و برکات کا اثر مزاج و کردار پہ آتا ہے۔ اِن سب مجاہدوں کا حاصل تو عقیدہ کی پختگی، کردار کی اصلاح اور زندگی کا شریعت میں ڈھل جانا ہے تو اِس بات پہ نگاہ کا رہنا ضروری ہے۔ ان نعمتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حصولِ علم آسان ہو جاتا ہے کہ مزاج میں نیکی آتی ہے تو ہر نیک بات دل میں اُترتی محسوس ہوتی ہے اور فضولیات میں دلچسپی نہیں رہتی، یہ اصولِ فطرت ہے کہ انسان کا مزاج جس

طرح کا ہوتا ہے اُسی طرح کی باتیں سننا پسند کرتا ہے اور وہ اُسے یاد بھی رہتی ہیں۔ جب یاد رہتی ہیں تو کردار کو متاثر کرتی ہیں کہ اصل مطلوب کردار کی اصلاح ہے۔

پھر پانچواں لطیفہ ——اِس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہوتا ہے۔ انوارات کا رنگ سبز ہوتا ہے اور بے شک 'ہُو' کی ضرب پانچویں لطیفہ پر لگتی ہے مگر یہ دوسرے چاروں لطائف کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ کہ تمام انبیاء علیہم السلام بھی سارا فیض حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے بھی نبی ہیں۔ لہٰذا جب پانچواں لطیفہ روشن ہوتا ہے تو سارا سینہ روشن اور منور ہو جاتا ہے اور سب لطائف کو عجیب قوت نصیب ہوتی ہے اور اگر پہلے چاروں لطائف میں کوئی کمی ہو تو وہ بھی پوری ہو جاتی ہے۔ اِس لطیفے پر بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ محنت یا مجاہدہ تو محض کہنے کی بات ہے۔ درحقیقت یہ تو برکات سمیٹنے کی بات ہے کہ جتنی سمیٹی جا سکیں اور اللہ کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی بات ہے۔ یہ وہ بارگاہ ہے کہ جہاں خستہ دامنوں کو دامن بھی نئے ملتے ہیں اور جس قدر انعامات سمیٹ سکیں کبھی روکا نہیں جاتا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو تمام انعامات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملے یعنی یہ وہ بحرِ کرم ہے جہاں سے لطف و کرم کے تمام چشمے پھوٹے۔ تو یقیناً اِس بارگاہ میں سارے کمالات تقسیم ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہوں یا آخرت کے۔ اور دنیا و آخرت کو الگ نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کے امور پر ہی آخرت کی نعمتیں عطا ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ جو امورِ دنیا میں تو پورے نہیں اُترتے اور سمجھتے ہیں کہ ہماری آخرت بن رہی ہے سب سے بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ برکاتِ نبوی سے عقیدہ درست اور اعمال میں سنتِ خیرالانام کا رنگ

آئے تو بات بنے اور پتہ چلے کہ واقعی لطیفہ روشن ہو رہا ہے کہ اس کی کرنیں کردار سے واضح ہوتی ہیں نیز ایمان وعقیدہ میں یقین کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا تصور بھی ذکرِ الٰہی اور شیخ کی توجہ کے بغیر ممکن نہیں۔

ہاں ایک عجیب بات!

کہ نسبتِ اویسیہ میں شیخ کی ضرورت نہیں اِس راہ سے بالکل ناآشنائی کی دلیل ہے۔ یہ سوال کسی نے حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا تھا تو انھوں نے فرمایا جو خواتین شادی نہ کریں وہ بچوں کی ماں نہیں بن سکتیں۔ ہاں دیگر سلاسل میں ہر مراقبہ کرنے کے لیے شیخ کی خدمت میں حاضری ضروری ہے جبکہ نسبتِ اویسیہ میں بھی ابتداءً تو ایسا ہی ہے ہاں ایک خاص مقام پر پہنچ کر، یعنی سالک المجذوبی سے آگے، پھر دنیا میں کہیں بھی ہو شیخ کی توجہ سے مستفید ہوتا رہتا ہے اور مراقبات آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ نیز اس کی خصوصیت ہے کہ بارگاہِ نبوی ﷺ میں شرفِ بیعت نصیب ہوتا ہے مگر وہاں تک لے کر جانے والا شیخ ہی ہوتا ہے۔ بعض نااہلوں نے متقدمین کی کتب دیکھیں اور اِس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ یہ سب کچھ ازخود ہو جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اِس جہالت کا اظہار بھی برملا کیا، ٹیلی ویژن پر کرتے ہیں۔ جو بہت بڑی جہالت ہے۔ اللہ کریم خوش فہمی اور جہالت سے محفوظ رکھے۔

تو جب یہ نعمت نصیب ہو تو سکون واطمینان کا وہ پرسکون سمندر نصیب ہوتا ہے جس کا اندازہ صاحبِ حال ہی کر سکتا ہے اور اتباعِ رسالت کی توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ کیفیاتِ قلبی، وارداتِ قلبی اور لذاتِ روحانی اِس سے الگ ہیں۔

ایں آں نعمت است کہ حسرت برد بر ایں

جویانِ تخت قیصر و ملک سکندری

اس کے بعد چھٹا لطیفہ ہے ـــــ لطیفۂ نفس ـــــ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اِس کا مقام پیشانی ہے۔ طریقۂ ذکر وہی پہلے کی طرح، لفظ 'اللہ' سانس کے ساتھ اندر جائے کہ دل کی گہرائی میں اُتر جائے اور سانس خارج ہو تو ساتھ 'ھُو' خارج ہو جس کا شعلہ پیشانی سے نکلے۔ اِس کا حاصل یہ ہے کہ نفسِ اَمّارہ رو بہ اصلاح ہو کر نفسِ لوّامہ بننا شروع ہو جاتا ہے اور اِس میں مثبت تبدیلی شروع ہو جاتی ہے۔ غلطیوں، کوتاہیوں پہ ندامت توبہ کا سبب بنتی ہے اور نیکی میں دلچسپی توفیقِ عمل کا باعث۔ جوں جوں سالک اِس پہ محنت کرتا جاتا ہے اُسی قدر توجہات کو جذب کرتا ہے کہ شیخ کی توجہ سورج کی کرنوں کی مانند برستی ہے۔ مجاہدے سے اپنے دل کو آئینہ بنایا جاتا ہے۔ جس کی استعداد اللہ کریم نے ہر انسان میں رکھی ہے۔ اِلّا یہ کہ انسان خود اِس کو ضائع نہ کر دے۔ معیار اِس بات کا کہ فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اِسی بات سے ہوتا ہے کہ یقینِ قلبی کا عالم کیا ہے؟ کیا زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال:۲) کی کیفیت نصیب ہے؟ اور یقین پختہ تر ہو رہا ہے؟ پھر اس کا اندازہ کردار و عمل اور ان میں خلوص سے کیا جا سکتا ہے۔ گویا ہر بندہ خود اپنا جج ہے۔

ایک بڑی لطیف سی بات ہے جس کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے کہ کہیں خود رائی تو پیدا نہیں ہو رہی۔ یعنی خود کو پارسا سمجھنا تو نہیں شروع کر دیا؟ اللہ نہ کرے اگر ایسا ہو تو سمجھ لے کہ فائدہ تو کیا ہونا تھا، مجھے نقصان ہو رہا ہے کہ خود بینی و خود رائی تب ہی پیدا ہوتی ہے جب عظمتِ الٰہی دھیان میں نہ رہے اور یہ ایسی بدنصیبی ہے کہ شیخ

کی توجہ کا راستہ بھی روک دیتی ہے۔

ایک بہت بڑی غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایسا آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ مجھے مراقبات ہو رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ شیخ کے ساتھ رہنے سے اس کے انوارات میں دور تک خود کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ پہچان اِس کی یہ ہے کہ ایسا آدمی اپنی پارسائی کو حصولِ دنیا کا سبب بنا لیتا ہے اور لوگوں سے فرمائشیں کر کر کے چیزیں اور دولت مانگتا ہے۔ اگر ایسی صورت ہو تو لوگوں کو بھی یہ جان لینا چاہیے کہ جسے وصالِ الٰہی یا حضوری بارگاہ رسالت نصیب ہو پھر وہ دنیا جیسی بے قدر شے کا لالچ کرے! یہ ممکن نہیں۔ ہاں ایسا شخص خود بھی خطرے میں ہے اور ہمیں بھی تباہ کرنے کا سبب بن سکتا ہے لہٰذا اِس سے ہر ممکن اجتناب کریں اور اگر کوئی شخص خود محنت کش ہو، اپنی روزی شرعی طریقے سے حاصل کرے، ساتھ لطائف میں روشنی اور گرمی پیدا کر لے، یقین و ایمان میں زیادتی اور اعمال میں خوبصورتی نصیب ہو تو پھر بات ہے۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا:

چنیں مردے کہ یابی خاکِ او شو
اسیرِ حلقۂ فتراکِ او شو

اور نیم پختہ یعنی بزعمِ خود جو صوفی ہیں ان سے بچو! کہ فرمایا:

مکن با صوفیانِ خام یاری — کہ با خاماں نہ باشی خام کاری
طریقِ پختہ کاری را نہ دانم — بخامی میوہ از باغت فشانند
وآں میوہ ز اصلِ خویش چیدہ — بہ مانند تا قیامت نہ رسیدہ

کہ ''ایسے نااہل تو کچا پھل توڑنے والے ہیں جو پھر کبھی پک نہیں سکتا۔ یعنی ایسے لوگوں کا ساتھ عمرِ عزیز کی پونجی کو کھو دینے کا سبب بنتا ہے۔''

لہٰذا سالک ان تمام امور کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔ جہاں تک انوارات کا تعلق ہے تو اِس لطیفہ پر بلکہ چھٹے، ساتویں دونوں لطائف پر تجلیاتِ باری ہوتی ہیں جن کا نہ تو کوئی رنگ متعین کیا جا سکتا ہے، نہ کیفیت۔ کبھی بجلی کی چمک ہر شئے کو ہر طرف سے روشن کر دیتی ہے اور کبھی کچھ نظر نہیں آتا مگر کیفیت، سرشاری اور گرمی اس کی اپنی ہوتی ہے اور اصلاحِ نفس اس کا حاصل ہوتا ہے کہ یہی راستہ نفس کو اَمّارہ سے لوّامہ اور لوّامہ سے مطمئنہ کی طرف لے کے جاتا ہے۔ درحقیقت یہ سب چیزیں کیفی ہیں اور کیفیات کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے، الفاظ میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اصلاحِ نفس کا لازمی نتیجہ، اصلاحِ اعمال و کردار ہے اور وہ بھی یا اللّٰہ کریم جاننے والے ہیں یا خود بندہ اپنا اندازہ کر سکتا ہے۔ دوسرے کو کیا خبر کہ کون سا عمل، اگرچہ وہ شریعت کے مطابق ہی ہو کس نیت سے کیا جا رہا ہے؟ اور اس میں کتنا خلوص ہے؟ کاش ہم دوسروں کو جج (Judge) کرنے کی بجائے اپنا اندازہ لگاتے، خود کا احتساب کرتے اور دیکھتے کہ میں کس قدر اطاعت کر رہا ہوں؟ اور کتنے خلوص سے کر رہا ہوں؟ یا یہ کہ دن بھر کتنی خطائیں سرزد ہوتیں ہیں اور کیوں کر اس کا تدارک کرتے؟ اللّٰہ کریم سے توبہ کرتے اور نیکی کی توفیق طلب کرتے۔

ساتواں لطیفہ ـــــ سلطان الاذکار ـــــ اِس میں سانس اندر جائے گا تو لفظ 'اللّٰہ' دل کی گہرائیوں میں لے کے جائے گا مگر جب خارج ہوگا تو 'ھُو' بال بال سے نکلے گا

اور سارے بدن کے ہر ذرے سے 'ھُو' خارج ہوکر ہر ذرۂ بدن کو ذاکر بنادے گا جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَقُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (الزمر:۲۳)

کہ کھال سے لے کر نہاں خانۂ دل تک ہر ذرۂ بدن ذاکر ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جاچکا کہ بدنِ انسانی میں اڑھائی کھرب سیل ہیں تو جب ہر سیل ذاکر ہوتا ہے تو تجلیاتِ باری ہر سیل کو روشن کر دیتی ہیں اور ایک بہت مضبوط قلبی اور دلی تعلق اللہ کریم سے پیدا ہوتا ہے جو بدونِ ذکر شاید ممکن نہ ہو۔ یہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی شان ہے کہ وہ تخلیقی طور پر نبی ہیں اور ان کا ہر ذرۂ بدن تخلیقی طور پر ذاکر ہوتا ہے اور بعثت سے قبل انھیں ایک خاص قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے جسے ولایت انبیاء کہتے ہیں۔ جو خاصۂ نبوت ہوتی ہے اور بہت ہی بلند منازل پر جاکر مخصوص اہل اللہ کو رسائی نصیب ہوتی ہے لیکن وہ اُن کا مقامِ ذاتی نہیں بن سکتی اُن کی رسائی محض ایسے ہوتی ہے جیسے شاہی محل میں خدامِ شاہی، کہ رہتے تو محل میں ہیں مگر محض خادمِ شاہی بن کر۔ محل اُن کا مقام یا گھر نہیں بن سکتا۔ انبیاء کے علاوہ سب کو یعنی تمام اُمتیوں کو انبیاء علیہم السلام کے قلوب کے نور سے یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین براہِ راست مستفید ہوتے ہیں۔ پھر تابعین کی وساطت سے، علیٰ ھذا القیاس جب تک وہ اُمت رہتی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب نئی نبوت آجاتی ہے تو پھر اس سے متعلق ہو جاتا ہے حتیٰ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ساری انسانیت کے لیے اور سارے زمانوں کے لیے مبعوث ہوئے کہ تکمیلِ نبوت ہوگئی یعنی سلسلہ

نبوت مکمل ہوگیا۔ یہی مراد ہے ختمِ نبوت سے۔ جسے سمجھنے میں تھوڑا سا اشتباہ ہو جاتا ہے کہ شاید اَب نبوت ختم ہوگئی۔ یہ کوئی جنس نہ تھی، نہ کسی دوکان پہ دستیاب تھی کہ ختم ہوگئی۔ نہیں۔ نبوت مکمل ہوگئی ہے۔ کسی نئے نبی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ لہٰذا اَب قیامت تک یہ سب برکات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاری رہیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز۔ یہ سب برکاتِ نبوت ہیں اور نبوت ہمیشہ کے لیے ہے تو برکات بھی ہمیشہ کے لیے ہیں۔

لہٰذا اس لطیفہ پر، باقی تمام لطائف میں اگر کوئی کسر رہ گئی ہو، تو پوری ہو جاتی ہے اور سالک کلی طور پر متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے کہ اُس کے بدن کا رُواں رُواں ذکر کر رہا ہوتا ہے۔ تجلیاتِ باری کی کیفیت تو وہی ہوتی ہے جو چھٹے لطیفے پر کہ ساتویں لطیفے پر بھی تجلیاتِ باری ہی ہوتی ہیں۔

ع دمِ پیدا دمِ دیگر نہان است

مگر بدن کا ہر سیل ذاکر ہو جاتا ہے۔ گویا اگر زبان کہتی یعنی ذکر لسانی ہوتا تو ایک بار اللہ کہتا مگر ذکر خفی قلبی نے ایک عجیب کرشمہ کر دکھایا کہ ہر لمحے اڑھائی کھرب بار اللہ کہتا ہے کہ وجود کا ہر سیل ذکر کرتا ہے۔ سبحان اللہ! یہ سعادت اللہ کریم کی عطا ہے اور برکاتِ نبوت سے نصیب ہوتی ہے ورنہ اس کا تصور بھی محال ہے۔

سلوک کی تمام کتب میں شیخ کی بہت زیادہ عظمت اور شیخ سے محبت پر سب سے زیادہ لکھا گیا۔ نثر میں بھی اور نظم میں بھی۔ یعنی بہت زیادہ احترام، بے پناہ محبت اور بڑے احسانات گنوائے گئے۔ اس کی وجہ تب سمجھ میں آتی ہے جب صرف لطائف ہی روشن ہو جائیں اور ذراتِ وجود ذاکر ہو جائیں۔ ہر سیل سے اللہ، اللہ کی صدا

نکلے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس ہستی نے کتنی محبت اور شفقت سے کتنی بڑی دولت عطا کر دی! رُواں رُواں شیخ کے لیے دست بدعا ہوتا ہے۔ شیخ ہر کوئی نہیں بن جاتا۔ کتنے بچے پڑھتے ہیں مگر سب اعلیٰ عہدوں تک نہیں پہنچتے ایسے ہی اللہ کے بہت سے خوش نصیب بندے اذکارِ قلبی سے بہرہ ور ہوتے ہیں مگر سب شیخ نہیں بن جاتے۔ کیونکہ اول تو اس کا حصول بہت محنت طلب اور اس کے ساتھ فطری استعداد کا محتاج ہوتا ہے کہ کسی فرد میں حصول برکات کی کتنی استعداد تھی۔ وہ وافر نصیب ہو تب بات بنے۔ پھر حاصل کرنا ایک کام ہے اور اسے تقسیم کرنا بالکل دوسرا کام۔ اِس کی استعداد بھی خداداد ہوتی ہے کہ اللہ کریم جسے عطا کر دے۔ یہ دونوں وصف ہوں اور توفیق مجاہدہ دوسروں سے کئی گنا زیادہ ہو۔ خلوص کی گہرائی اتھاہ اور یقین کی پختگی ناقابلِ شکست۔ تب ایسے افراد میں سے چن کر شیخ کے منصب پر فائز کیے جاتے ہیں۔ جو ریلوے کے انجن کی مثال ہوتے ہیں کہ نہ صرف اپنے لیے مجاہدہ کرتے ہیں بلکہ بے شمار لوگوں کو ان کی منزل تک پہنچانے کا سبب بنتے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی عظمت کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

خیر یہ بات بھی ضروری تھی۔ اگرچہ ضمناً آ گئی اس موضوع پر طریق السلوک فی آداب الشیوخ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جس میں متقدمین کے ارشادات یکجا کر دیے گئے ہیں۔

ساتواں لطیفہ بھی منور ہو جائے تو پھر یہ ساری قوت جمع کر کے پہلے لطیفے یعنی قلب پر متوجہ ہوتے ہیں اور پوری قوت جواب تک حاصل کی گئی تھی اسے یکجا کر کے تھوڑی دیر کے لیے ذکر کرنے کے بعد رابطہ کیا جاتا ہے۔

مراقبات

# رابطہ

رابطہ درحقیقت اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ اللہ کریم جب چاہے، جسے چاہے، اس سے نوازے۔ بندہ تو صرف اپنی تمام توجہ اس طرف مبذول کرسکتا ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ من جانب اللہ بندے کو نصیب ہو۔ جیسے ارشاد ہے:

وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْقَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الکہف:۱۴)

کہ ہم نے اصحاب کہف کے قلوب سے رابطہ فرمایا۔ جب انھوں نے کہا ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔

یعنی رابطۂ الٰہی کی وجہ سے وہ جرأتِ رندانہ نصیب ہوئی کہ بادشاہ اور قوم کے مقابلہ میں وہ توحید پر جم گئے۔ یا اُمِّ موسیٰ علیہ السلام کے بارے ارشاد ہوتا ہے:

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (القصص:۱۰)

کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے قلب سے رابطہ نہ کرتے کہ وہ اپنے

ایمان و یقین پر ثابت قدم رہیں تو وہ انھیں دریا میں ڈالنے کے بعد یہ راز، راز نہ رکھ پاتیں۔

اسی طرح صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے ارشاد ہے:

وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (الانفال:11)

کہ ہم نے تمہارے قلوب سے رابطہ کیا کہ تم قدم جما کر لڑو۔

اور جگہ پر بھی ارشادات ہیں۔ مفہوم سب کا ایک ہی ہے کہ اللہ کریم سے ایک خاص تعلق نصیب ہو جاتا ہے جس میں ثابت قدمی اور اعلیٰ درجے کا یقین نصیب ہوتا ہے اور کوئی طاقت قدموں میں لرزہ پیدا نہیں کر سکتی۔ جیسے اصحابِ کہف نے وقت اور قوم و حکومت کی ساری طاقت کی پرواہ نہ کی یا والدہ موسیٰ علیہ السلام نے الہام والقاء پر ایسا یقین کامل پایا کہ بچے کو دریا میں ڈال دیا اور پھر اس راز کو راز ہی رکھا۔ یعنی ایک سکینہ کا نزول ہوتا ہے۔

ایسے ہی سالک جب تمام توجہ اور سب لطائف کے انوارات قلب پر لا کر متوجہ الی اللہ ہوتا ہے تو اسے رابطہ نصیب ہوتا ہے اور وہ انوارات قلب سے اُٹھ کر سیدھے عرشِ عظیم تک جاتے ہیں اور یوں ذکر بھی ایسے ہوتا ہے کہ لفظ 'اللہ' تو قلب میں جائے مگر جب سانس خارج ہو تو 'ھُو' کی ٹکر عرشِ عظیم سے لگے۔ اس طرح انوارات کا ایک بہت روشن راستہ بن جاتا ہے جو سالک کے قلب سے عرش تک ہوتا ہے اور روح کے عالمِ بالا کے سفر کا سامان ہو جاتا ہے۔ اس پر بہت زیادہ توجہ اور محنت کی جاتی ہے کہ رابطہ ہی کی قوت روح کو قوتِ پرواز عطا کرتی ہے کہ روح کا اصل وطن

تو عالمِ امر ہے جو نو عرشوں سے اوپر ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے اور یہی کامیابی ہے کہ دارِ دنیا کی آلودگیوں سے نکل کر وہ سلامتی کے ساتھ اپنے اصل مقام پر پہنچ کر آگے وصالِ الٰہی کی طرف بڑھے۔ چنانچہ عرشِ عظیم کے ساتھ رابطہ ہی پہلی کاوش ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ ہوتا تو من جانب اللہ ہے۔

جیسے ارشاد ہے:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗٓ (المائدۃ:۵۴)

کہ اللہ کریم ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں کہ بندہ کب محبت کر سکتا ہے جب تک وہ بے نیاز نہ کرے۔ لیکن اس کا بھی سلیقہ ہے:

فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۱)

کہ تم میرا (یعنی رسول اللہ ﷺ کا) اتباع کرو تو اللہ تم سے محبت فرمائے گا۔ اِس سے مصداق یہ آپ ﷺ ہی کی اطاعت ہے کہ ذکرِ قلبی کی تاکید و تلقین بے شمار ہے۔ پھر اس کے بعد جب متوجہ الی اللہ ہوتا ہے تو یہ اتباعِ سنت ہے۔

طریقہ اس کا یہ ہے سانس کو فطری طور پر چلنے دے جو پہلے تو سات لطائف پر عمداً اور تیزی سے چلتی ہے۔ پھر کچھ دیر قلب پر بھی لگا کر کہ تمام گرمی، حرارت، روشنی اور انوارات یکجا قلب پہ جمع ہو جائیں تو متوجہ الی اللہ ہو۔ اَب فطری طور پر چلتی سانس کے ساتھ، ہر اندر جانے والی سانس کے ساتھ لفظ 'اللہ' قلب میں اُترے اور ہر خارج ہونے والی سانس کے ساتھ 'ہُو' کی ضرب عرشِ عظیم سے جا کر لگے تو یہ انوارات اللہ کریم سے رابطہ عطا فرما دیتے ہیں کہ قلب سے لے کر عرشِ عظیم تک انوارات کی

ایک سڑک کہہ لیجیے یا ایک بہت وسیع ،مضبوط اور روشن راستہ کہہ لیجیے ، بن جاتا ہے اور یوں ایک خاک نشین ،عرشِ عظیم سے رابطہ میں ہو جاتا ہے۔ جب یہ مضبوط ہو جاتا ہے اور لطائف روشن ہو کر اس کی قوت بنتے ہیں تو اس کے بعد مراقبۂ احدیت کرایا جاتا ہے۔

# مراقبہ احدیت

مراقبہ احدیت کیا ہے؟ آیہ کریمہ

اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (البقرۃ:۱۶۳)

پہ تفکر۔ اوراس کے انوارات وکیفیات سے مستفید ہونا۔

یہ درحقیقت عرشِ عظیم کا دروازہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ راہِ سلوک میں پہلی منزل ہے۔ سالک اپنی روح کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ پھر شیخ توجہ دے کر راہنمائی کرتے ہوئے اسے احدیت پہ لے جاتا ہے۔ اَزخود یہ کام ہرگز ممکن نہیں کہ زمین سے احدیت تک کا فاصلہ بہت زیادہ ہے جو تقریباً پچاس ہزار سال اور وہ بھی نوری سال کا بنتا ہے۔ اَزخود کوئی جس قدر بھی کوشش کرے، راستے کی وسعتوں میں گم ہو جائے گا۔ ممکن نہیں کہ منزل پہ پہنچ سکے۔ ہاں شیخ کی توجہ آنِ واحد میں رسائی کا سبب بن جاتی ہے اور یہ اللہ کریم کا خصوصی انعام ہے۔ حضرتِ استاذ المکرّم رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شیخ احدیت پہ رُوح کو پہنچادے تو پھراس سے کسی اور کرامت

کا انتظار ایک فضول بات ہے۔ یہ بجائے خود بہت بڑی کرامت ہے۔

یہ ایک سفید روشن منزل ہے۔ بہت بڑی عمارت ہے۔ رُوح جا کر دروازے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ بلند ستونوں پہ استوار دروازہ اور راہداریاں سامنے ہوتی ہیں۔ سفید انوارات ہر سمت نظر آتے ہیں اور خصوصاً سامنے سے بڑے واضح آرہے ہوتے ہیں۔ اگر مشاہدہ ہو تو اندر جائیں تو تھوڑا آگے جانے کے بعد دائیں کو راہداری مڑتی ہے۔ جس کے سامنے ایک بہت بڑا اسٹیڈیم جیسا نظر آتا ہے۔ جو مخلوق سے بھرا ہوتا ہے۔ جوان نسبتاً کم اور بزرگ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ سب وہ بزرگ ارواح ہیں جن کا وصال مقام احدیت پہ ہوا۔ یہاں تک اسباق تھے کہ دنیا سے رخصت ہوئے تو رُوح کو وہاں قیام نصیب ہوا۔ یہاں سے دائیں مڑیں تو پھر آگے دائیں طرف ایک کمرہ، بہت خوبصورت اور سجایا ہوا، نظر آتا ہے۔ اندر داخل ہوں تو سامنے وقت کا شیخ جلوہ افروز ہوتا ہے۔ جس زمانے میں جو بھی اس دور کا سب سے عظیم شیخ ہو، وہ وہاں جلوہ گر ہوتا ہے۔ یہ بھی عجیب نظامِ قدرت ہے کہ ایک شیخ ایک وقت میں متعدد مقامات پر دکھائی دیتا ہے۔ حضرت استاذ المکرّم رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے یہ تعددِ امثال ہے۔ یعنی ایک صورت ایک وقت میں کئی جگہ دکھائی پڑتی ہے۔ جیسے کسی کمرے میں کئی آئینے لگے ہوں۔ بندہ اندر داخل ہوگا تو ہر آئینے میں نظر آئے گا۔ یہ راستہ تمام طریقِ سلوک کا ہے کہ طریقِ ذکر بے شک جدا جدا ہو منزل سب کی ایک ہے۔ اگر محض رسومات نہ ہوں واقعی سلسلہ کی نسبت نصیب ہو تو پھر منازل یہی ہیں اور ہر سلسلہ کے لوگ اول احدیت ہی پہ پہنچتے ہیں اور اگر دولتِ مشاہدہ پائیں تو شیخِ وقت کو وہاں پاتے

ہیں۔ خواہ وہ کسی سلسلہ سے ہو، اپنے عہد میں وہ سب سے بلند منازل اور واصل باللہ شخص ہوتا ہے۔ نیز اصل کرامت اور اِن سب مجاہدات کا ماحصل اتباعِ شریعت اور اس خلوص کی گہرائی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس کوئی شخص آ کر ٹھہرا اور تین ماہ خانقاہ میں رہنے کے بعد رُخصت کا طالب ہوا۔ آپ نے پوچھا آپ اتنا عرصہ رہے، آنے کا مقصد بیان نہیں کیا اور اَب رخصت کے طالب ہو۔ اس نے عرض کیا کہ آیا تو سلوک سیکھنے کے لیے تھا۔ کرامت کے انتظار میں رہا مگر تین ماہ میں کوئی کرامت نہ دیکھ کر مقصد بیان نہ کیا۔ اَب نااُمید ہو کر رُخصت کا طالب ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ تین ماہ ایک عرصہ ہوتا ہے۔ آپ رات دِن خانقاہ میں رہے۔ کوئی کام خلافِ شریعت دیکھا؟ عرض کیا میں عالم ہوں اور شریعتِ مطہرہ سے واقف ہوں کوئی کام خلافِ شریعت نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا عملی زندگی شریعت کے تابع ہو تو اِس سے بڑی کونسی کرامت ہو سکتی ہے؟ وہ نادم ہو کر معافی کا طلبگار رہا اور سلوک سیکھنا شروع کیا۔

تو حاصل یہ ہوتا ہے کہ توحیدِ باری پر یقین پختہ ہو کر اس درجہ کو پہنچتا ہے کہ انسان عملی زندگی میں اطاعتِ الٰہی پر کاربند ہو جاتا ہے اور غیر اللہ سے اُمیدیں منقطع ہو کر تمام اُمیدیں بارگاہِ الوہیت سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور انسانی اعمال کا مدار اس کی اُمیدوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ وہ یا نفع کی اُمید پر اطاعت کرتا ہے یا نقصان کے خوف سے کسی کی اطاعت کا دم بھرتا ہے۔ جب اُمید اللہ وحدہ لاشریک سے وابستہ ہو جائے تو جذبۂ اطاعت اللہ جل جلالہ کے لیے وقف ہو جاتا ہے اور یہی برکاتِ نبوت ہیں کہ نبی جب کسی کو تعلیم فرماتا ہے تو وہ صرف الفاظ یا تھیوری (Theory) نہیں ہوتی ویسی کیفیات

بھی قلبِ نبوت سے مترشح ہوکراس عمل پہ کمربستہ کردیتی ہیں۔ جوکمالِ اطاعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ظاہر ہے وہ برکاتِ نبوت ہی کے سبب سے ہے۔ چنانچہ مشائخ نسلاً بعد نسلٍ اور سینہ بہ سینہ اسی کے امین ہیں اور یہی برکات سالکین میں تقسیم ہوتی ہیں اور یہی پیری مریدی کا اصل مقصد ہے کہ ایک تو کسی بھی جاننے والے سے جو روزمرہ کے امور کا علم رکھتا ہو، بیعتِ اصلاح درست ہے تاکہ بندہ شیخ کی راہنمائی میں شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے لیکن اگر کیفیات قلبی اور حضورِ حق کا طالب ہے تو پھر شیخ میں کم اَزکم فنافی الرسول ﷺ تک لے جانے کی قوت ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ مراقبہ اُمیدوں کا مرکز بھی ذاتِ باری کو بنا دیتا ہے۔ ایک جذبۂ محبت نصیب ہوتا ہے اور عملی زندگی میں بہت خوب صورت تبدیلیاں آتی ہیں کہ اصل مقصد، پورے خلوص سے نبی کریم ﷺ کا اتباع ہے۔

اس مراقبہ کی تسبیح غالباً ''رموزِ دل'' میں لکھی جا چکی ہے کہ اصل تو یہی آیہ کریمہ ہے جو بیان کردی۔

طالب کو یوں وابستہ کیا جاتا ہے کہ وہ کہتا ہے:

فاذ اللہ منزہ بے چون وچگوں

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (البقرۃ:۱۶۳)

وحدہ لاشریک لک یا اللہ

چنانچہ مقامِ احدیت پہ کھڑے ہوکر اِس تسبیح کو بزبانِ رُوح دُہراتا رہتا ہے۔ زبانی بھی دُہراتا ہے تو خیر ہے لیکن روح کو اس کی تکرار کرنی چاہیے۔

لطائف کے بعد مراقبات پہ کافی وقت لگانا چاہیے۔ محض خانہ پری نہ کی جائے۔ بلکہ اپنے اوقاتِ کار سے وقت نکال کر ذکر اور مراقبات پر وقت لگایا جائے تا کہ یہ چیزیں راسخ ہو جائیں اور ان کے فوائد عملی زندگی میں نظر آئیں کہ مقصدِ حیات اتباعِ رسالت، جو خلوصِ دل سے نصیب ہو اور خلوص کی گہرائی یہی تو ہے۔

# مراقبۂ معیت

دوسرا مراقبہ معیت کا ہے۔ جو اِس آیہ کریمہ کے مطابق ہے:

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید:۴)

کہ تم جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

جب مراقبۂ معیت مضبوط اور راسخ ہو جائے تو طالب کو آگے چلایا جاتا ہے اور 'اللہ ھُو' کہہ کر روح اوپر اُٹھتی ہے تو مقامِ معیت پہ پہنچتی ہے۔ یہ بھی بالکل ویسا ہی مقام ہے جیسا احدیت پہ تھا۔ اِس کے ستونوں اور انداز میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اِس پہ انوارات کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ ساری عمارت بھی سبز رنگ کی ہے۔ یہ دراصل سب انوارات ہی ہیں۔ عمارتیں بھی کوئی گارے پتھر کی نہیں۔ انوارات ہی مختلف صورتوں میں متشکل ہو جاتے ہیں۔ صورتِ حال ساری وہی ہے۔ ویسی ہی راہداریاں، کھلی جگہ، شیخِ وقت کا حجرہ اور بے شمار بابرکت ارواح، جن میں اکثریت عمر رسیدہ حضرات کی ہوتی ہے کہ عمریں لگا کر یہاں تک رسائی حاصل کی، پھر وصال ہوا تو روح کا یہ مقام قرار پایا

مسکن بنایا گیا۔ قبر یا مدفن سے روح کا تعلق بجا لیکن اکثر قیام ان کا یہاں ہی ہوتا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ تعددِ امثال بھی ہے۔ اِسے سمجھنے کے لیے یہ مثال کافی ہے کہ جیسے سورج کی بے شمار کرنیں، چار دانگِ عالم میں پھیل جاتی ہیں اور ہر کرن سورج سے وابستہ بھی ہوتی ہے اور خود سورج بھی۔ اَب ہر ہر کرن سے قدرت بہت سے کام لیتی ہے۔ جانداروں، پودوں اور جمادات تک سب کو اپنے اپنے طور پر متاثر کرتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے نہ سورج کو خبر ہوتی ہے، نہ کسی کرن کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی بدولت کیا کام ہو رہا ہے؟ اِسی طرح اولیاء اللہ کی ارواح بھی تعددِ امثال میں ڈھل جاتی ہیں، مگر ہر مثال اپنے اصل سے متعلق اور اسی کی کرن ہوتی ہے اور ان کے طفیل فیض اور برکات پہنچتی ہیں۔ خواہ ان کو خبر ہو یا نہ ہو کہ ان کا جاننا ضروری نہیں۔ یہاں تک کہ خود اللہ کریم کوئی شے منکشف فرما دیں۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لی جائے کہ بعض جدید علمأ نے عذاب وثوابِ قبر کا انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ عذاب وثواب جسم مثالی کو ہوتا ہے جو قبر میں نہیں ہوتا۔ سجین میں یا کہیں اور ہوتا ہے۔ یہ درست نہیں۔ جسم مثالی ہوتا ہی نہیں۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ اس کا سختی سے رد فرماتے تھے کہ سبحان اللہ! کیا بات ہے کہ جسمِ مثالی نہ دنیا میں آیا، نہ وہ شرعاً مکلّف ٹھہرا، نہ اس نے نیکی کی، نہ گناہ کا ارتکاب اور اسے محل جزا و سزا ٹھہراتے ہیں۔ یہ ہرگز درست نہیں۔ ہاں روح کی تمثیلات، اسی کی کرنیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ایک وقت میں روح کا متعدد مقامات پر مشاہدہ ہونا تعددِ امثال کہلاتا ہے اور عالمِ امر کے بہت آخر کے دوائر میں جا کر سالک کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ سب کو نہیں، جسے اللہ جل شانہ

چاہے کہ وہ رُوح کو ہر مقام پر بیک وقت دیکھتا ہے۔

بہر حال سالک رُوح کو ایک عظیم بارگاہ کے بہت بڑے دروازے پہ کھڑا دیکھتا ہے۔ جہاں در و دیوار سبز، روشنی سبز اور دروازے سے سبز رنگ کے انوارات آرہے ہوتے ہیں۔ وہاں کی تسبیح ہے:

اللہُ حاضری اللہُ ناظری اللہُ معی

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (الحدید:۴)

پہلی حاضری میں پوری تسبیحات پڑھ کر پھر اس آیہ کریمہ کو دہراتا رہتا ہے۔ ہر بار دہرانے سے کیفیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ روح ضرور دہراتی رہے جس کے لیے سالک کا متوجہ ہونا ضروری ہے۔

دُہراتا رہے۔ اچھی بات ہے۔

اِس مراقبہ کا جو اثر زندگی اور اعمال و کردار پر آتا ہے وہ مقصدِ حیات ہے۔ یہ احساس قوی تر ہو جاتا ہے کہ میرا اللہ، میرا معبود، میرا مالک، میرا رب ہر وقت میرے ساتھ ہے۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ دیکھ رہا ہے۔ جو میرے دِل میں ہے وہ اس سے بھی واقف ہے۔ یہ کیفیت جس قدر پختہ ہوتی ہے اتنی ہی اطاعت اور اتباعِ شریعت کی توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ بندہ پورے خلوص سے اور ڈوب کر اطاعت کرتا ہے۔ پھر غیر اللہ کا خوف اُٹھ جاتا ہے اور غیر اللہ سے اُمید منقطع ہو جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جو ملنا ہے وہ اللہ کریم سے ملنا ہے تو اس کی پسند کے خلاف کسی کی غلامی یا خوشامد کیوں کروں؟ گناہ کی جرأت نہیں رہتی کہ پہلے تو سنا سنایا ایمان تھا کہ اللہ جل شانہ ہر جگہ موجود

ہے، ہر شے سے واقف ہے۔ ان انوارات معیت کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور اگر مشاہدہ نہ بھی ہو تو وجدانی طور پر محسوس ہوتا ہے جو مشاہدہ سے بھی قوی تر ہے، تو گناہ سے بچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر کبھی غفلت میں غلطی سرزد ہو جائے، کہ بشر ہی تو ہے تو احساسِ ندامت گھیر لیتا ہے۔ یہ ندامت ہی توبہ بلکہ اصل توبہ ہے یوں عملی زندگی کی بہت اِصلاح ہوتی ہے۔ نیز توہمات سے جان چُھوٹ جاتی ہے۔ اور معاشرے کی یہ گمراہی کہ کسی نے کچھ کر دیا ہے مجھ پہ جادو ہے، بچوں پر کسی نے تعویذ کر دیے ہیں، ان خرافات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اللہ کی معیت نصیب ہے تو پھر ایسے توہمات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔ ایک عجیب سا سکون اور سرشاری نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کے سارے کام بھی شرعی طریقے سے کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے تو ان میں برکت بھی ہوتی ہے اور سب عبادت بھی قرار پاتے ہیں۔ خرافات اور فضول گوئی سے اللہ کریم بچاتے ہیں کہ ہر ہر لفظ تول کر منہ سے نکالتا ہے۔ یوں دنیا کی زندگی بھی سنجیدہ، خوب صورت اور مزیدار ہو جاتی ہے۔ کبھی اکتایا ہوا نہیں ملتا کہ اکثریت کو دیکھیں تو ہمہ وقت تقدیر کا شکوہ ہو رہا ہے اور پریشان حال بیٹھے ہیں۔ حالانکہ سب کچھ تو اپنے اعمال کی بدولت ہو رہا ہے مگر اس کا احساس نہیں ہوتا۔ سالک کو ان باتوں سے نجات نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کریم کی عطا سے کردار بھی سدھر جاتا ہے اور اس کے نتائج بھی اور اسی دنیا میں ایسے آرام وسکون سے رہتا ہے کہ ایک گونہ جنت میں جی رہا ہو۔ بے شک روکھی سوکھی ملے مگر اُس میں لذت اسی لیے ہوتی ہے کہ زندگی میں سکون ہوتا ہے اور یہ وہ دولت ہے کہ اس کے لیے امرأ و حکمران ترستے رہتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ، صرف وہ جو

اتباعِ شریعت کرتے ہوں۔ دیارِ مغرب کو دیکھ لیجیے، ہر شخص انجانے خوف میں مبتلا ہے اور یہی زندگی اُن کے لیے جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ لہٰذا اِس مراقبہ سے جو کیفیات ولذاتِ قلبی اور سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے اس کے ساتھ عملی زندگی بھی اتباعِ رسالت ﷺ میں ڈھل جاتی ہے۔

اور یہ یاد رہے کہ سارا تصوف، سارا سلوک صرف اور صرف دل کی گہرائیوں سے اتباعِ شریعت کی توفیق حاصل کرنے کے لیے ہے۔ یہ تماشا نہیں کہ آنکھ بند کی اور کچھ روشنیاں، کچھ رنگ نظر آ گئے۔ ہر گز نہیں۔ یہ شعبدہ بازی نہیں، زندگی کی بازی ہے اور سب کچھ ہار کر نصیب ہوتی ہے کہ جب بندے کو اپنی احتیاج کا صحیح ادراک ہو جائے اور عظمتِ الٰہی کو اپنی حیثیت کے مطابق سمجھنے لگے تو راہِ سلوک کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق ملتی ہے۔ یہ اللہ کریم کی بے پناہ نعمت ہے جو بارگاہِ رسالت پناہی ﷺ سے تقسیم ہوتی ہے۔ اِس پر اعتراض کرنے اور سوالات کھڑے کرنے والے اگر اتنی محنت اس کو جاننے اور سمجھنے پہ صرف کریں تو انھیں سب جوابات بھی مل جائیں اور رحمتِ باری بھی نصیب ہو جائے۔

# مراقبہ اقربیت

یہ ابتدا میں تیسرا مراقبہ ہے۔ اِن تینوں کو ملا کر مراقباتِ ثلاثہ کہتے ہیں یعنی
پہلے تین مراقبات۔ یہ مراقبہ آیہ کریمہ :

نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ (قٓ:١٦)

کے تحت کیا جاتا ہے۔ جس کا ترجمہ ہے :

ہم انسان کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔

ظاہر ہے جو ہستی جسم کے ہر سیل کو بناتی اور مٹاتی ہے اور موت وحیات دیتی
ہے، یقیناً وہ شہ رگ سے زیادہ قریب ہے کہ شہ رگ تو خود انھیں سیلوں (Cells) سے
بنتی ہے اور اس میں جو خون جاری ہے وہ بھی اِنھیں سیلوں (Cells) سے بنتا ہے۔ جو
قادر کریم اِن سیلوں (Cells) کو بناتا ہے اور پھر خون، گوشت اور ہڈیوں کا روپ دیتا
ہے یقیناً وہ سب سے قریب تر اور ہر ایک سیل کو بنا اور مٹا رہا ہے۔

اِس مراقبہ پر تیز سرخ رنگ کے انوارات آتے ہیں۔ درودیوار سرخ ہیں۔

ہاں برآمدے، ستونوں کی ساخت احدیت، معیت سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ سالک خود کو عظیم دروازے کے سامنے کھڑا پاتا ہے۔ جس کے اندر سے سرخ روشنی آرہی ہوتی ہے اور بالکل ویسے ہی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اگر اندر داخل ہو کر آگے جا کے دائیں والی راہداری میں مڑ جائے تو اس عظیم سٹیڈیم میں جا نکلتا ہے جس میں بے شمار ارواح جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ یہ سب بزرگ، وہ حضرات ہوتے ہیں جن کا وصال اِس مراقبہ میں ہوا تو انھیں برزخ میں بھی یہاں تک رسائی حاصل ہے۔ یاد رہے کہ برزخ میں اُسی رُوح کو قوتِ پرواز حاصل ہوتی ہے جو دنیا میں برکاتِ نبوت حاصل کر کے رُوحانی مقامات حاصل کرے اور اُتنی ہی نصیب ہوتی ہے جتنی اُس نے حیاتِ دنیوی میں حاصل کی ہو۔ ورنہ نیک، صالح، عالم، عابد و زاہد جس قدر بھی نجات حاصل کر لے یا برزخ میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لے اُسے ایک مقررہ مقام نصیب ہوتا ہے اور قبر سے اس مقام کا رابطہ رہتا ہے۔ وہ رُوح اُسی مقام پر رہ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اُسے قوتِ پرواز نصیب نہیں ہوتی۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ برکاتِ نبوت کی اہمیت کس قدر ہے اور وہ ہستیاں جنھیں مشائخ کہتے ہیں کس قدر عظیم ہوتی ہیں کہ برکاتِ نبوت حاصل کرتی ہیں، عمریں لگا کر، مجاہدے کر کے اِس دولت کی امین بنتی ہیں اور پھر اللہ کی رضا کے لیے اُسے ماوشما میں تقسیم فرماتی ہیں۔ عظیم مشائخ بہت ہی کم لوگوں کو اِس دولت سے آشنا فرماتے تھے۔ اگرچہ ان کی خدمت میں لاکھوں لوگ حاضر ہوتے، ان کی اِصلاح بھی فرماتے اور زبانی اذکار اور وظائف کی تلقین فرماتے مگر ذکرِ قلبی معدودے چند لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ اِس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر گراں مایہ

ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کو اِس قابل نہیں جانتے تھے۔ ہمارے عہد میں مولانا احمد علی لاہوری رحمتہ اللہ علیہ عظیم ہستی تھے۔ بندہ کی معلومات کے مطابق بالائی عرشوں کی منازل میں وصال ہوا۔ اور اپنے عہد کے قطب ارشاد تھے۔ اقطاب چار ہوتے ہیں، گہے تین بھی، تو گویا پوری دُنیا کے چار پانچ چوٹی کے سر برآوردہ حضرات میں سے ایک ہستی تھے۔ مگر ان کے وصال کے بعد کوئی ایک بندہ لطائف کرنے والا بھی نہیں ملتا۔ فقیر نے اُن کے ماہنامہ خدام الدین لاہور میں خود پڑھا تھا کہ فرماتے ہیں "میں نے یہ دولت پینتالیس برس لگا کر حاصل کی ہے۔ اگر کوئی میرے پاس چار سال گزارے تو میں اس کو فنافی الرسول کرا دوں گا، رُوحانی طور پر بارگاہِ رسالت میں پہنچا دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ اہل خانہ کو چار سال کا خرچ دے کر آئے اور اپنا چار سال کا خرچہ ساتھ لائے، چار سال میرے ساتھ گزارے۔"

کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غرباء میں تو اس کی سکت نہیں اور امرأ اس چیز کے طالب کب ہوتے ہیں؟ ہاں حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے بہت سے علماء کو یہ نعمت پہنچائی۔ مگر اس میں انھیں بہت دُکھ بھی اُٹھانے پڑے۔ بعض بدنصیب شاگرد خود بھٹک گئے اور بجائے توبہ کرنے کے حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ پر کفر تک کے فتوے لگائے۔ اگرچہ عہدِ رسالت پناہی میں تو یہ روحانی نعمتیں بانٹی نہیں لٹائی جاتی تھیں اور ہر وہ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، عالم یا اَن پڑھ، امیر، فقیر جس کی نگاہ ایمان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ پڑی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک اس پر پڑ گئی، شرفِ صحابیت سے سرفراز ہوا۔ اگر ساری دنیا کی ولایت بھی جمع کی جائے تو اس کی گردِ پا کو نہیں پہنچ سکتی کہ وہ

صحابیؓ ہے۔ یہ سنت عہدِ صحابہ میں قائم رہی اور مجلس پانے والا تابعی کہلایا پھر تابعین کی مجلس پانے والا تبع تابعی کہلایا۔ یہ تین مبارک زمانے خیر القرون کہلاتے ہیں۔ یعنی تمام زمانوں میں بہترین زمانے۔ پھر یہ نعمت دنیا سے اُٹھ گئی۔ صرف اُن ہستیوں کونصیب ہوئی جنھوں نے مجاہدات کر کے اور توجہ حاصل کر کے اگلوں سے انوارات حاصل کیے اور لطائف روشن کر کے مراقبات کی نعمتوں کو پایا اور یوں سلاسلِ تصوف وجود پذیر ہوئے۔ جس میں اللہ کریم کے بڑے بڑے نامور بندے شامل ہیں مگر سب ولایت کو پا سکے جو بہت بڑا انعام ہے۔ عہد اول میں تو اکثر علماء اِسے حاصل کرتے۔ آئمہ، سارے کے سارے خواہ تفسیر یا حدیث کے تھے یا فقہ کے، صوفی تھے۔ بعد میں یہ دولت کم ہوتی گئی۔

آج اول تو علم بھی کم خوش نصیب حاصل کرتے ہیں، چند تقریریں یاد کر کے مولوی ہونے کے مدعی بن جاتے ہیں اور پھر نہ صرف یہ کہ اس دولت کو پانے کی سعی کریں، اس کے رد پہ کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ اعاذ نااللہ منہا۔ ہاں شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انھیں ایک دفعہ شاہِ جنات کے دربار میں ایک مسئلہ کے سلسلے میں تشریف لے جانا پڑا تو انھوں نے مسئلہ بیان فرمایا تو وہاں ایک بوڑھا جن موجود تھا۔ جو آنکھوں کے پپوٹے از خود نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ اس نے اُنگلیوں سے پپوٹے اُٹھا کر مجھے دیکھا اور فرمایا ''آپ کے بتانے پہ یاد آیا کہ جب یہ مسئلہ حضور اکرم ﷺ نے بیان فرمایا تھا، میں وہاں موجود تھا۔'' اس پہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ''میں تابعی ہوں کہ میں نے صحابی جن کی زیارت کی ہے۔'' بندہ کو دو سال پہلے

جنات کے معاملہ میں اتفاق ہوا تو کشمیر کے پہاڑی سلسلہ میں جنات کی ایک آبادی میں ایک جن عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود تھے، جو ضعفِ پیری کے باعث حرکت نہ کر سکتے تھے۔ سٹریچر یا بستر پر تھے، مگر صحابی تھے۔ تو فقیر نے انھیں دارالعرفان تشریف لانے کا عرض کیا۔ پھر غالباً اس کے چھ ماہ بعد میرے دوبارہ عرض کرنے پر انھوں نے منظور فرمایا اور ایک شب اُن کے خدام اُنھیں سٹریچر پر لے کر دارالعرفان آئے۔ بندہ نے اُن سے پوچھ کر انڈوں کی ایک ڈش (Dish) بنوائی۔ انھوں نے دو گھونٹ چائے فقیر کی پیالی سے نوش فرمائی اور بقدر چھ سات چمچوں کے وہ ڈش کھائی اور وہ کچھ دیر رُک کر تشریف لے گئے۔ فقیر نے پس ماندہ ڈش حلوے میں ملا کر بہت سے احباب کو حلوہ کھلایا۔ اَب کئی ماہ گزرے اُن کا وصال ہو چکا ہے۔ ایک صحابی جن اور بھی تھے جن سے فقیر کی ملاقات نہ ہو سکی۔ پتہ چلا۔ مگر اب وہ بھی دارِ بقا جا چکے ہیں۔ فقیر کی معلومات کے مطابق اَب اُس دور کے کوئی مسلمان جن شاید باقی نہیں رہے۔ تو اس اعتبار سے فقیر بھی تابعی ہے۔ مگر یاد رہے! صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کیفیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے وہ صرف انسانی خاصہ ہے۔ جناتِ میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ حاصل کر سکیں۔ تو جب حاصل نہیں کر سکتے تو آگے تقسیم کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں ایک نسبت تو بہر حال ہے۔ جو اللہ کے بندوں کو نصیب ہوتی ہے۔

تو یہ سب راستے حصولِ برکات کے ہیں۔ اِس مراقبہ میں قربِ الٰہی کی عجیب کیفیات نصیب ہوتی ہیں۔ کیفیات قلم بند نہیں ہو سکتیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں۔ ان کے لیے الفاظ وضع نہیں ہوئے۔ کیا خوب کہا گیا ہے:

درد کے گننے کو اعداد بنے ہی کب تھے

ہم نے بھی سیماب یونہی بار اُٹھا رکھا ہے

تو یہ سب صرف محسوس کی جا سکتی ہیں اور ان کے نتائج عملی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔ ہاں خیر القرون کے بعد یہ سنت متروک ہوگئی کہ ہر آنے والے کو کیفیاتِ قلبی نصیب ہوں۔ مگر چودہ سو سال بعد حضرت العلام اللہ یار خان رحمتہ اللہ علیہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ انھوں نے سنت کو پھر سے زندہ کر دیا۔ آپ کی خدمت میں جو بھی آیا اُسے ذکرِ خفی قلبی نصیب ہوا حتیٰ کہ زندگی کے ہر شعبہ کے لوگ مستفید ہوئے۔ مرد، خواتین، بزرگ، جوان، عالم، غیر عالم ہر طرح کے لوگ اُس بزم سے سینہ روشن لے کر آئے۔ ہمارے دیہات میں مساجد میں پانی بھرنے اور صفائی کرنے کے لیے گاؤں کا کوئی غریب آدمی رکھا جاتا ہے اور عموماً دیکھا گیا ہے کہ یہ لوگ خود نمازی نہیں ہوتے لیکن حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کی مسجد کا خادم بھی فنا فی الرسول سے سرفراز تھا اور یہ برسوں کا کام وہاں دنوں میں ہوتے بھی دیکھا ہے۔ اگرچہ فقیر کو لطائف پہ برسوں لگے مگر یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک شخص آیا، ہفتہ بھر خدمت میں ٹھہرا اور لطائف، مراقبات فنا، بقا حتیٰ کہ سالک المجذوبی تک حاصل کر کے چلا گیا۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم۔

اذکارِ قلبی سے کیفیاتِ قلبی نصیب ہوتی ہیں اور وہ عملی زندگی کو متاثر کرتی ہیں۔ اعضاء و جوارح اور اعصاب دماغ کے تابع کام کرتے ہیں مگر خود دماغ دل کے تابع ہوتا ہے۔ دِل سیاہ ہو تو دماغ برائی سوچتا ہے، برائی کرنے کا حکم دیتا ہے اور

اعضاء وجوارح برائی کرتے ہیں، لیکن اگر دل روشن ہوجائے اور اُسے تعلق باللہ نصیب ہوتو نیکی کا حکم دیتا ہے۔ دماغ نیکی کا سوچتا ہے اور اعضاء وجوارح نیکی کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہر شخص کی استعداد الگ ہوتی ہے، لہٰذا جتنی استعداد ہوتی ہے اُسی قدر وہ اثر پذیر ہوتا ہے اور جتنا اثر قبول کرتا ہے اتنی مثبت تبدیلی ہوتی ہے۔ ہاں یہ یقینی امر ہے کہ ہر ذاکر میں مثبت تبدیلی بفضل اللہ ضرور ہوتی ہے اور مسلسل ترقی کرتی رہتی ہے اور اس کے مثبت نتائج کردار میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ بھی اصولی بات ہے کہ جب تک اللہ کی ذات اور صفات پر یقین پختہ نہ ہوتو اطاعت کیسے ہو؟ اور اس کا واحد راستہ رسالت پر ایمان اور رسول ﷺ کی اطاعت اور اتباع ہے۔ اِن کیفیات وبرکات سے بارگاہِ رسالت سے وہ رشتہ نصیب ہوتا ہے جو ان کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ ایمان اور یقین کے لیے روح کا درجہ رکھتی ہیں مگر جان وہی سکتے ہیں جنھیں اللہ کریم عطا فرماتے ہیں۔

احدیت، معیت، اقربیت یہ تینوں مراقبات، مراقباتِ ثلاثہ کہلاتے ہیں۔ یہ اِبتدا ہے مقاماتِ سلوک کی۔ اللہ کریم نصیب فرمائے تو بات بن سکتی ہے کہ مقصدِ حیات تو ایمان کی پختگی ہے اور وہ اِس قدر ہو کہ اطاعت اور توفیقِ عمل نصیب ہو۔ یہ اس کا سب سے مضبوط ذریعہ اور سبب ہے۔

درحقیقت ہر نعمت کا تعلق عمل اور مجاہدے سے ہے۔ مگر لوگ صرف باتیں بناتے ہیں، عمل سے جی چراتے ہیں اور جس نعمت کو حاصل نہیں کر سکتے اُس کا انکار کرنا آسان سمجھتے ہیں۔ پھر اس پر ہی بس نہیں کرتے اللہ کے بندوں کو تنقید کا نشانہ بنا کر

انھیں ایذا پہنچاتے ہیں جو ایک قبیح عمل ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ جس شعبے میں آپ داخل ہی نہیں ہوئے، اُسے جانا ہی نہیں، جاننے کی کوشش ہی نہیں کی اُس پر رائے دینے یا تنقید کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔ فقیر کی رائے میں یہ جہالت ہے۔ اللہ کریم اپنی پناہ میں رکھے۔

# دوائرِ محبت

مراقباتِ ثلاثہ کے بعد دوائرِ ثلاثہ ہیں۔ انھیں دوائرِ محبت کہا جاتا ہے۔ ان کی تسبیح آیہ کریمہ:

یُحِبُّهُمْ وَ یُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدۃ:۵۴)

ہے کہ اللّٰہ ﷻ اُن سے محبت کرتے ہیں اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

محبت ایک عجیب جذبہ ہے کہ ہر شے محبوب پہ نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ محبت لینے اور مطالبات کا نام نہیں کہ میرا یہ کر دو، مجھے وہ مل جائے، بلکہ جو کچھ پاس ہوتا ہے وہ محبوب کے قدموں میں لٹانے کو جی چاہتا ہے۔ اگر بات لینے دینے پہ آجائے تو محبت نہیں ہوگی بلکہ اُسے کاروبار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ محبت تو دینے اور نچھاور کرنے کا نام ہے۔ جیسے شاعر نے کہا ہے:

''فان المحب لمن یحب مطیع''

کہ محبت کرنے والا محبوب کا بندۂ بے دام بن جاتا ہے۔ پھر اللّٰہ ﷻ اور اس

کے رسول ﷺ سے محبت ! کہ محبت نبوی ﷺ، محبت الٰہی کا پیش خیمہ ہے اور محبتِ الٰہی چونکہ سب سے قیمتی ہے لہٰذا انسان کو جو اور جتنا بھی اختیار دیا گیا وہ اس کی سب سے قیمتی دولت اور اثاثہ ہے اور عشقِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ یہ سب سے قیمتی دولت اور اثاثہ اُس پہ نچھاور کر دیا جائے۔ انسان کی اپنی پسند و ناپسند رضائے باری میں فنا ہو جائے۔ گویا عملی زندگی تو ایک طرف سوچ، خیال، تمنا اور آرزو تک رضائے باری میں ڈھل جائے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ شریعت کے سامنے ایسے ہو جائے جیسے غسال کے ہاتھ میں میت کہ وہ ہلائے تو ہلے، نہ ہلائے تو نہ ہلے۔

اَب یہاں مسئلہ اور پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان ان اشیاء یا اُن ہستیوں سے محبت کر سکتا ہے جو اس کے دائرۂ علم میں ہوں۔ جنھیں وہ جان پہچان سکے تو محبت کرے۔ اللہ کریم خالق ہے۔ مخلوق کے احاطۂ علم سے ماوریٰ ہے تو بندہ اس کی محبت میں کیسے گرفتار ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب قرآنِ کریم نے عطا فرمایا ہے:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران: ۳۱)

کہ اگر تم اللہ سے محبت کے طالب ہو تو میرا اتباع کر لو۔ اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا۔

اور جب اللہ کریم محبت کرے گا تو لازماً تمہارے دل میں اس کے جواب میں محبت پیدا ہو جائے گی بلکہ عالم یہ ہو جائے گا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرۃ: ۱۶۵)

کہ جنھیں ایمان نصیب ہو جاتا ہے کائنات میں سب سے زیادہ محبت اللہ ہی

سے کرتے ہیں۔

یعنی جو گرفتارِ عشق ہو جائیں اُن کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر حال میں عشقِ الٰہی میں سرشار رہتے ہیں۔

محبت کا ایک عجیب اصول ہے کہ انسانی محبت بھی اثر سے خالی نہیں۔ آپ کسی سے دل سے محبت کرتے ہوں تو اس کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر کسی سے نفرت کرتے ہوں تو بظاہر اس سے بہت اچھا سلوک بھی کرتے رہیں، اندر سے وہ بھی آپ سے نفرت ہی کرے گا۔ بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ میں تو فلاں سے محبت کرتا ہوں مگر وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ دراصل ایسے لوگوں کو محبت ہوتی ہی نہیں۔ اپنی اغراض ہوتی ہیں جنھیں وہ محبت کا نام دیتے ہیں لہٰذا اُن کا جواب تو غرض کی صورت ہی میں آئے گا۔ یعنی جس کو آپ سے غرض ہوگی وہ محبت ظاہر کرے گا کہ یہ اغراض کے سودے ہیں۔ انھیں محبت کا نام دینا درست نہیں۔ محبت ہمیشہ بے لوث اور بے غرض ہوتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمیشہ اپنا جواب حاصل کرتی ہے۔ اگر انسانی جذبۂ محبت جواب چاہتا ہے تو پھر اللہ کی محبت کا کیا رنگ ہوگا۔ اِسی لیے ارشاد ہے کہ اللہ اُن سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیا لوگ ہوں گے جن سے اللہ کریم محبت کرتا ہے اور وہ کیا جذبہ ہوگا کہ وہ اللہ کریم سے محبت کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

یہ عجیب لذت ہے:

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

اللہ! اللہ! یہ کرنے کے کام ہیں، باتوں سے سمجھنے سمجھانے کے نہیں۔ ہاں اللہ کریم اس کا کوئی ذرہ بھی عطا کردیں تو بات بن جاتی ہے۔

# دائرۂ محبت اوّل

یہ مراقبہ اسی آیہ کریمہ کے تحت ہوتا ہے:

يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدۃ:۵۴)

سالک خود کو اقربیت پہ کھڑا دیکھتا ہے۔ عجیب رنگوں کا ایک دائرہ اس کی پیشانی کے گرداگرد ہوتا ہے۔ جو بہت بڑا ہوتا ہے اور اُس کا مرکز پیشانی ہوتا ہے لیکن اُس کی کرنیں چھن چھن کر ساری روح پہ بھی پڑتی ہیں اور عجیب سی لذتوں میں گم کر دیتی ہیں۔ سالک ایک مرتبہ کہہ کر:

''اصل دائرہ اسمائے صفات میں سے اُوپر نفس میرے کے۔''

پھر يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ کی تکرار کرتا رہتا ہے۔ دل میں بھی اور روح کی زبان سے بھی۔

یوں جتنی دیر اُس پہ لگائے گا، جتنا مجاہدہ کرے گا، اتنا ہی مراقبہ پختہ تر ہوتا چلا جائے گا۔

# دائرۂ محبت دوم

سالک پیشانی کے گرداگرد پہلے دائرہ کے گرد دوسرا بڑا دائرہ دیکھتا ہے جو پہلے دائرہ سے بڑا اور اس سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔ سالک ایک مرتبہ یہ کہہ کر:

"اصل، اصل دائرہ اسمائے صفات میں سے اوپر نفس میرے کے۔"

پھر یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ کی تکرار دل میں بھی کرے اور ہاں رُوح بھی کرتی رہے۔

ایک حدیثِ مبارک کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کی وسعتیں عرش کے مقابلے میں ایسی ہیں جیسے کسی صحرا میں کوئی انگوٹھی، لہٰذا اس اعتبار سے ان دوائر کی وسعت کا اندازہ لگایا جائے تو حیرت ہوتی ہے پھر ان کے اپنے رنگ، اپنے انوارات اور اپنی روشنیاں ہیں۔ جن میں سے ہر رنگ، روشنی اور ہر ذرۂ نور سے محبت ٹپکتی ہے اور سالک کی رُوح کو سرشار کرتی ہوئی قلب کی گہرائیوں تک اُترتی ہے اور یوں سالک اطاعتِ باری اور اتباعِ رسالت کا پابند ہوتا چلا جاتا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ لوگوں میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ صوفی نکمّے

ہوتے ہیں۔ ہاں نقلی صوفی یقیناً نکمّے ہوتے ہوں گے مگر جنھیں حقیقی تصوف اور سلوک نصیب ہو وہ غیر صوفی سے بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ عملی زندگی میں غیر صوفی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پھر صرف یہی نہیں کہ کام زیادہ کرتے ہیں بلکہ ہر کام سنت کے مطابق کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔ اِسی لیے حضرت رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہر صوفی عالم ہوتا ہے۔ اگر خود عالم نہ ہو تو کسی عالم کے ساتھ ہوتا ہے۔ یا پھر اللہ کریم اُسے علمِ لدُنّی عطا کردیتے ہیں کہ عمل کے لیے شرط ہے۔ جانے گا نہیں تو عمل کیسے کرے گا۔ لٰہذا یہ لوگ دین سے واقف، دین پہ شیدا اور باعمل و باکردار ہوتے ہیں۔ اللہ کریم ایسے لوگوں کی رفاقت نصیب فرمائے تو اُس کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان ہے۔ پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیا ہوتے ہیں۔ فقیر کا تجربہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا کے ہر موضوع پر بات کرسکتے ہیں۔ نہ جانے یہ کس طرح ان چیزوں کو جانتے ہیں۔ پھر ہمیشہ ان کی رائے تمام امور میں بہترین ہوتی ہے۔ یہ صرف دعوت و اصلاح پہ بات نہیں کرتے بلکہ عملی زندگی میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

بہرحال یہ دوائر اگرچہ سلوک کی بنیادی منازل ہی ہیں۔ مگر ہمیشہ بنیادیں ہی تو عمارت کی مضبوطی کی ضامن ہوا کرتی ہیں اور بنیاد ہی اِس بات کی ضمانت مہیا کرتی ہے کہ عمارت کتنی بلند ہوگی۔ ان دوائر کے انوارات ایسی کیفیات نصیب کرتے ہیں کہ مشتِ غبار کو عشقِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم

# دائرۂ محبت سوم

دوسرے دائرے کے گرداگرد تیسرا دائرہ۔ یہ سورج کی طرح روشن اور بہت عظیم ہوتا ہے۔ اِس سے جذبات و کیفیاتِ محبتِ الٰہی وہ اثر کرتی ہیں جو سورج کی کرنیں زمین سے روئیدگی پہ کرتی ہیں کہ روئیں روئیں سے عشقِ الٰہی پھوٹتا ہے۔

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں

تیرا مجبور کر دینا ، میرا مجبور ہو جانا

ایسے قوی جذبات جسم کے ایک ایک سیل (Cell) سے نمودار ہوتے ہیں کہ بندہ سراپا اطاعت بن جاتا ہے۔

''حلیۃ الاولیاء'' میں حضرت ذوالنون رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد نقل ہے کہ کسی نے پوچھا کیا نشانی ہے کہ پتہ چلے یہ بندہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔

فرمایا اللہ کی پسند کو دل سے پسند کرتا ہو اور اللہ کی ناپسند کو ناپسند اور اُسے نہ کسی کی تعریف کی پرواہ ہو اور نہ کسی مخالف پراپیگنڈہ سے متاثر ہو۔ وہ اللہ سے

محبت کرتا ہے۔

حضرت بسر بن اسری رحمتہ اللہ علیہ کا اِرشاد اِسی کتاب میں ہے۔ فرماتے ہیں اللہ سے محبت کا اظہار، اس کی اطاعت سے محبت، سے ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اللہ کے ذکر سے محبت، سے ہوتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان فرماتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ میں نے کس سے سنا؟ یاد نہیں۔'' ورنہ وہ ہمیشہ واقعات کا حوالہ بیان فرمایا کرتے ہیں۔ مگر اس واقعہ کے بارے اُن کا ارشاد ہے کہ یاد نہیں کس سے سنا کہ قیس حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہم عصر اور دوست تھا۔ لیلیٰ کے عشق میں مبتلا ہو گیا تو جب حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمامِ اقتدار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دی اور یوں اُمتِ مسلمہ ایک انتشار سے بچ گئی اور پھر سے فتوحاتِ اسلامیہ کا آغاز ہوا اور اللہ کا پیغام دُنیا پر پھر سے پھیلنا شروع ہوا تو حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے۔ قیس بھی ہم رکاب تھا۔ راستے میں بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا قیس! میں نے حکومت کی قربانی دے کر امت کو بے اتفاقی سے بچانے کا کام کیا ہے۔ تو وہ جواباً بولا کہ حکومت آپ کو بجتی ہی نہ تھی اور نہ ہی امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بجتی ہے۔ تو انھوں نے حیرت سے اُسے دیکھا کہ تمہارے خیال میں حکومت کسے ملنی چاہیے تھی؟ تو کہنے لگا بجتی تو لیلیٰ کو تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا'انت مجنون' کہ ''تو پاگل ہے۔'' تب سے اُس کا نام ہی مجنوں پڑ گیا۔ اَب دیکھیں! کہ ایک بندے کو بندے سے عشق ہے تو اسے ہر مقام پر وہی بندہ دکھائی دیتا ہے۔ بھلا کسی کو

عشقِ الٰہی نصیب ہو جائے تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ بہت عجیب اور نرالے لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ ان تک رسائی اور اُن سے موانست عطا کر دے تو دو عالم سدھر جاتے ہیں۔ یہ اللہ کریم کی بہت بڑی نعمت ہے کہ شیخِ کامل میسر آ جائے اور ربِ جلیل اس کی پیوستگی میں خلوص عطا کر دے پھر ان باتوں کی سمجھ آتی ہے۔

اس دائرے کی تسبیح بھی وہی ہے۔ پہلے ایک مرتبہ:

''اصل، اصل، اصل دائرہ اسمائے صفات میں سے اوپر نفس میرے کے۔''

کہہ کر پھر وہی آیہ کریمہ:

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدۃ:۵۴)

دل سے بھی ادا کرے اور روح بھی دہراتی رہے اور عطائے باری کا تماشا دیکھے کہ کس طرح ایمان ویقین میں پختگی آتی ہے اور کس قدر اتباعِ رسالت کی توفیق ارزاں ہوتی ہے۔ کشف ومشاہدہ عطا ہو تو کیا بات ہے۔ ورنہ وجدانی طور پر ضرور محسوس ہو جاتا ہے۔ کچھ بھی نہ ہو تو حقیقی شہادت تو قوتِ ایمانی میں اضافہ اور توفیقِ عمل ہے۔ یہی جذبۂ محبت جوں جوں راسخ ہوتا ہے، حصولِ قرب کی تمنا پیدا کرتا ہے۔ اور جوں جوں یہ تمنا بڑھتی ہے، اعمال وکردار سنت میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور خلوصِ دل میں گہرائی اور گیرائی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سلوک کی کوئی انتہا نہیں کہ حصول قربِ الٰہی ہے۔ انسانی زندگی تو خیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ برزخ اور آخرت جو ابدی اور دائمی حیات ہے، وہاں جنت میں اہلِ جنت کو ترقی ملتی رہے گی اور ابد الآباد اس کی کوئی حد نہ آئے گی۔

ہاں مراقبات کو انسان ایک حد تک جان سکتا ہے۔ ممکن ہے دارِ دنیا میں ربِ جلیل نے ایک حد رکھی ہو۔ مگر وہ بھی انسانی اعداد و شمار سے کہیں لمبے فاصلے اور انسانی ظاہری علوم کی حدود سے بہت بلند تر مقامات ہیں۔

اِن سب میں رسائی کے لیے بنیادی استعداد بنیادی مراقبات سے نصیب ہوتی ہے لہٰذا ان پر بھرپور توجہ اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور شیخ کے ساتھ جو لمحے نصیب ہو جائیں وہ تو عجیب شے ہیں۔ احباب کے ساتھ ذکر نصیب ہو گا تو وہ بھی کچھ دیر ہو گا۔ اس سب کے علاوہ بھی بہت سا وقت لگانا چاہیے۔ تاکہ یہ چیزیں راسخ ہو جائیں اور نتائج دیں۔ جن کے بارے عرض کیا جا چکا ہے کہ اتباعِ رسالت کی بھوک لگے اور جیسے زندگی کا انحصار آب و دانہ پر ہے، اس سے زیادہ اتباعِ سنت سے وابستہ ہو جائے۔

# مراقبہ اسمِ ظاہر و باطن

اگلا مراقبہ اسمِ ظاہر و باطن کا ہے۔

یہ مراقبہ آیہ کریمہ:

هُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (الحدید:۳)

کے تحت کیا جاتا ہے اور یہ بہت ہی عجیب شے ہے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ روح کو پرواز کے لیے پر عطا ہوتے ہیں۔ یعنی اِس مراقبہ سے قوتِ پرواز عطا ہوتی ہے۔

اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب سالک اس طرف متوجہ ہوتا ہے اور دل میں اِس آیہ کریمہ کی تلاوت کرتا ہے اور روح اپنے مقام پر اس کی تلاوت کرتی ہے تو وہ سارے انوارات جو ان دوائر سے مترشح ہو رہے تھے، روح میں سمانے لگتے ہیں اور یوں جذب ہونا شروع ہو جاتے ہیں جیسے لوہے میں آگ داخل ہو کر اُسے بھی آگ بنا دیتی ہے۔ رُوح میں انوارات یوں سماتے ہیں کہ اس کے آگے پیچھے، اوپر نیچے، اندر

باہر، جدھر خیال کریں نور ہی نور ہوتا ہے۔ اور خود رُوح کا ایک ایک جز و اس سے منور ہو جاتا ہے۔ ایک سرشاری کی کیفیت روح پر طاری ہو کر اِس قدر مضبوط ہوتی جاتی ہے کہ بدن ظاہری بھی اُسے محسوس کرنے لگتا ہے اور انگ انگ میں کیفیت سی بھرنے لگتی ہے۔

کچھ بھی نہ تھا تو اللہ کریم کی ذات تھی۔ جو کچھ اللہ نے تخلیق فرمایا سب مخلوق ہے اور فانی ہے۔ سب کچھ فنا ہو جائے گا، تو بھی اللہ کی ذات موجود ہوگی۔ کسی میں ظاہری حسن و جمال ہے تو اللہ کی عطا ہے، اس کا کمال ہے۔ اور اگر کسی کے اندر کوئی کمال یعنی کمالِ باطنی ہے، تو بھی اُسی کی عطا ہے۔ مگر اس بات کا علم رکھنے اور جاننے کے باوجود اِس سب کو محسوس کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اول تو اکثریت ایسی ہے جسے ان حقائق سے آشنائی ہی نہیں۔ ہاں ہر کمال کو وہ اپنی طرف منسوب کرتے ہیں۔ صرف جہاں خامی یا کمزوری ہو، ناکامی ہو تو وہ اللہ کریم کے ذمے لگا دی جاتی ہے۔

بات بن جائے تو شان یہ تدبیر کی ہے

اور بگڑ جائے خطا کاتبِ تقدیر کی ہے

یہ تو وہ لوگ ہیں جو ان حقائق سے بے خبر ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے یہ سب کچھ کتابوں میں پڑھا ہے اور جاننے کی حد تک واقف ہیں مگر اِسے محسوس نہیں کر سکتے کہ عملی زندگی میں ویسے ہی خواہشات کے اسیر ہیں جیسے نہ جاننے والے۔ مگر اہل اللہ جنھیں یہ نعمتیں نصیب ہوتی ہیں ان حقائق کو محسوس کرتے ہیں اور یوں ان کی عملی زندگی، ان کی خواہشات اور آرزوئیں تک عظمتِ الٰہی کے تابع ہو جاتی

ہیں۔ انسان سب ہی ایک جیسے ہیں۔ ان کا محسوس کرنے کا طریقہ ایک سا ہے، دکھ سکھ کو وہ بھی محسوس کرتے ہیں بلکہ دوسرے سے زیادہ کرتے ہیں مگر فرق یہ ہے کہ انسان کو شکایت پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ اس کا اظہار کرے یا نہ کرے مگر سوچتا ضرور ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر اہل اللہ کو شکایت نہیں ہوتی۔ وہ جانتے ہیں کہ جو اللہ کریم نے کیا ہے وہی درست ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ کائنات کا وسیع ترین نظام بڑی نزاکت سے ایک دوسرے میں پیوستہ ہے۔ اس میں کوئی ایک تبدیلی اکیلی نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے سے پیوستہ، بہت سی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ کچھ کا ہمیں اندازہ ہوتا ہے اور بے شمار تبدیلیوں کا ہمیں علم ہی نہیں ہوتا۔ مگر وہ قادرِ مطلق ہر شے کا خالق و مالک ہے اور کس چیز کو کہاں رکھنا ہے وہ بہتر جانتا ہے۔ انسان اس بے پناہ وسیع کائنات میں چند روز کے لیے وارد ہوتا ہے اور اکثر اپنی ضروریات سے بھی مکمل آگاہی سے پہلے موت کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ بھلا کائنات کے امور میں کیا مشورہ دے گا۔ لیکن اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو جائے۔ یوں اپنی چند روزہ زندگی کو بے سکون رکھتا ہے۔ مگر جب یہ دولت نصیب ہوتی ہے اور ان مراقبات کے انوارات قلوب پر وارد ہوتے ہیں تو بندے کی ذاتی پسند کی بات نہیں رہتی بلکہ وہ اللہ کریم کی رضا پہ راضی رہنا سیکھ پاتا ہے اور یوں زندگی سکون سے بسر کرتا ہے۔ بلکہ موت کے بعد بھی اُن کے چہرے پرسکون ہوتے ہیں۔ اِسی نظامِ قدرت کا حصہ انسانی کردار بھی ہے کہ تقدیر دو طرح سے ہے:

اول۔ قضائے مبرم ــــ جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کریم کے اٹل فیصلے ہیں۔

دوم۔ قضائے معلق — جو انسانی کردار سے متعلق ہوتی ہے کہ اگر نیکی کرے گا تو نیک نتائج اور صلہ پائے گا۔ اگر نافرمانی کرے گا تو اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر رحمتہ اللہ علیہ کے واقعہ میں قرآن کریم میں موجود ہے کہ انھوں نے (حضرت خضرؒ نے) ایک کم سن بچے کو قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض فرمایا۔ بعد میں جب انھوں نے وضاحت فرمائی تو بتایا کہ یہ بچہ مزاجاً برائی کی جانب مائل تھا اور بڑا ہو کر والدین کے لیے ہی پریشانیاں پیدا کرنے والا تھا مگر اس کے والدین نیکی کی راہ پر گامزن تھے۔ سو اللہ کریم نے اسے اُٹھا لیا۔ میں نے مرضی سے یہ نہیں کیا۔ اللہ کا حکم تھا۔ لہٰذا علماء حق لکھتے ہیں کہ اُس کے بعد بیٹی عطا ہوئی جس کی اولاد میں ستر نبی پیدا ہوئے جو قضائے معلق تھی۔ اگر وہ نیکی کی طرف نہ آتے تو وہی بیٹا دنیا میں بھی پریشان کرتا اور آخرت بھی خراب ہوتی مگر انھوں نے رجوع الی اللہ کر لیا تو ان کے کردار کے مطابق فیصلہ ہو کر انھیں کس قدر سرفراز کر گیا۔ لہٰذا اِس کارِ جہاں میں باتوں کو سمجھنا بھی آسان نہیں چہ جائیکہ اُن پر رائے دی جائے یا "ایسا ہو جائے" کی خواہش کی جائے۔ عافیت کا راستہ صرف ایک ہے کہ اللہ کریم کے فیصلوں پہ اُس کا شکر ادا کیا جائے۔ یہ بات سمجھ میں تو آتی ہے مگر ایسا کرنا اور عملاً اُسے اپنانا آسان نہیں۔ یہ برکاتِ نبوت کے بغیر ممکن نہیں اور برکات کا حصول سلوک ہی سے ممکن ہے۔ یوں یہ نعمت زندگی کو بھی سنوار دیتی ہے اور آخرت کو بھی۔ سلوک و تصوف لیک بیش بہا دولت ہے اللہ کریم نصیب فرما دے تو بات بنے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

ایں آں سعادت است کہ حسرت برد برایں

جویانِ تخت و قیصر و ملکِ سکندری

بہرحال ان نعمتوں کا ادراک تو اُن لوگوں کو جو اپنی عمریں راہ سلوک میں لگا دیتے ہیں، اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ جو اکثریت اس کا انکار کیے بیٹھی ہے وہ بھلا کیا جان سکے گی۔ یہ جو میں عرض کرر ہا ہوں یہ تو ابجد کی بھی ابتدا یعنی ا، ب ہے۔ اِس کے آگے بیکراں سمندر ہیں۔ مگر یہ اولوالعزم لوگوں کا میدان ہے اور جان ہارنے اور زندگی کی بازی لگا دینے والوں کا کام۔

# مراقبۂ عبودیت

اگلا سبق مراقبۂ عبودیت ہے۔

اس کی تسبیح ہے:

النَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (الرحمٰن:٦)

مفہوم ہے کہ ہر نجم وشجر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے۔ یعنی ہر شے اس کی عظمت کا اقرار اور اپنی بے مائیگی کا اعتراف کرتی ہے۔ بظاہر دیکھیں تو ستارے اور سیارے طلوع ہوتے ہیں تو سر جھکا کر غروب بھی ہوتے ہیں۔ اگر زمین چوبیس گھنٹوں میں اپنا چکر مکمل کرتی ہے تو لازماً ہر چیز سر بسجود بھی ہوتی ہے۔ یہ تو عقلِ ظاہری کی گرفت میں آنے والی باتیں ہیں۔

اِس مراقبہ میں سالک خود کو ایسی جگہ پہ پاتا ہے کہ جہاں زمین و آسمان اور مافیھا، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، میدان، درخت، جھاڑیاں حتیٰ کہ ایک ایک تنکے کو سر بسجود پاتا ہے۔ یہاں بھی ایک عبرت آموز واقعہ فقیر کے سامنے پیش آیا۔ غالباً

ساٹھ (۶۰) کی دہائی کی بات ہے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ چکوال تشریف لائے تھے اورشہر کے اندر، بازار کے پیچھے حکیم فضل کریم صاحب کی جگہ پر قیام تھا کہ سوال پیش ہوا۔ اس مراقبہ میں وہ آیہ کریمہ پڑھی جاتی تھی جس پہ سجدہ واجب تھا۔ عرض کیا گیا کہ سب احباب کو پتہ بھی نہیں ہوتا، جنھیں پتہ نہیں ان کا سجدہ رہ جاتا ہے اور جنھیں پتہ بھی ہے اکثر یاد نہیں رہتا یا سستی ہوجاتی ہے تو یہ آیہ کریمہ بدل دی جائے اور اس مفہوم کی کوئی اور آیہ کریمہ تجویز کی جائے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ تصوف میں مجدد کا درجہ رکھتے تھے۔ اِس کے باوجود فرمایا یہ تو مشائخ کی اجازت سے ممکن ہے۔ اَز خود تو ہم کچھ نہیں بدل سکتے کہ برکات ان الفاظ سے مرتب ہوتی ہیں جو مشائخ نے فرمائے ہیں۔ ورنہ تو سارے مسلمان سارا قرآن پڑھتے ہیں اور کوئی کیفیت نہیں پاتے۔ چنانچہ ایک ساتھی جو نوجوان تھے، ایک دین دار اہلِ حدیث خاندان سے تعلق تھا۔ مراقبات تو فنا، بقا تک ہی تھے مگر مشاہدات بہت اچھے تھے، وہ حافظ نہ تھے (اگرچہ مجلس میں اعلیٰ پائے کے حفاظ بھی تھے) انھیں حکم ہوا کہ حضرت اللہ دین مدنی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں میری طرف سے گزارش پیش کرو اور دیکھو کیا فرماتے ہیں۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کی عادت مبارک تھی کہ مشائخ سے بات کرنا مقصود ہوتی تو کسی بھی صاحبِ کشف شاگرد کے ذمہ لگاتے۔ فرماتے میرے پاس بیٹھ جاؤ، میں توجہ کروں گا اور ان شاء اللہ تمہیں غلطی نہ لگے گی۔ خود بپاسِ ادب بات کرنے کی جرأت نہ فرماتے۔ ایک مرتبہ کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کے مقامات، مراقبات تو بہت بلند ہو چکے، اللہ کریم نے آپ کو بہت ہی بلند منازل تک رسائی عطا فرمادی، آپ اَب تو مشائخ سے بات کرلیا

کریں تو مسکرا کر فرمایا میاں! بیٹا اگر جرنیل بھی ہو جائے تو باپ پھر جرنیل کا باپ ہوتا ہے۔ اس کی عظمت اپنی جگہ اور ادب بدستور بڑھتا جاتا ہے چنانچہ اُس نوجوان ساتھی نے عرض کیا کہ حضرت سلطان العارفین اللہ دین مدنی رحمتہ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ آئندہ یہ آیہ کریمہ پڑھا کریں: اَلنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ اس پر سجدہ واجب نہیں۔ لیکن افسوس وہ ساتھی خود بے چارہ اس راہ پر قائم نہ رہ سکا۔ دراصل اس کے مزاج میں بات بات پر اعتراض پیدا ہوتا تھا۔ شاید یہ کوئی خاندانی اثر تھا۔ وہ اِسی کی زد میں آ کر سلسلہ سے جاتا رہا۔ اور پھر دیکھا کہ اعمال ظاہری میں بھی ٹھوکریں لگنے لگیں۔ اَب فوت ہو چکا ہے اور اُس کا معاملہ اللہ کے حضور ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تمام مسلمانوں کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمائے۔ آمین

اِسی طرح فقیر کے ساتھ مراقبات کرنے کے بعد لاہور کے ایک ساتھی نے اعتراض کیا کہ دوائرِ محبت میں پہلے دائرۂ محبت میں اصل ایک بار، دوسرے میں دو بار اور تیسرے میں تین بار کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ فقیر نے عرض کیا کہ شیخ المکرّم نے تعلیم فرمایا، ہم نے اَز بر کر لیا۔ سوال دل میں آیا ہی نہیں کہ پوچھتے مگر میرے دل میں خیال گزرا کہ یہ شخص اِس راہ پہ شاید نہ چل سکے اور وہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد ذکر اذکار چھوڑ بیٹھا۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ پوچھنا یا سوال کرنا منع ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ سوال جاننے اور سمجھنے کے لیے ہوتا ہے۔ ضرور کیا جائے اور بات کو سمجھا جائے مگر یاد رہے کہ اعتراض، بنیادی طور پر سوال سے علیحدہ چیز ہے اور اس میں خیال ہوتا ہے کہ میں بہتر جانتا ہوں۔

یہ شخص اتنا بھی نہیں سمجھ سکا جو میں کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا سوال اور اعتراض میں بہت فرق ہے۔ اور یہ راہ اعتماد کی ہے۔ یہاں اعتراض کی گنجائش نہیں۔

اِس مراقبہ کا اثر عملی زندگی پہ ایسا عجیب ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے کو بھی سربسجود پاتا ہے اور اپنی روح بھی سربسجود ہوکر:

"سبحان ربی الاعلیٰ"

پکار رہی ہوتی ہے۔ تو انوارات مترشح ہوکر بدن کے روئیں روئیں میں آرزوئے سجدہ کو بیدار کر دیتے ہیں اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہر کوئی استفادہ کرتا اور گوہرِ مقصود پاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت زین العابدین ایک مسجد میں نوافل ادا فرما رہے تھے کہ مسجد میں آگ لگ گئی۔ لوگ باگ بھاگے، پانی وغیرہ ڈال کر بجھانے لگے۔ آپ نے جب سلام پھیرا تو استفسار فرمایا شور کیسا ہے؟ عرض کیا گیا آگ لگ گئی تھی سو بجھا دی گئی۔ فرمایا "مجھے خبر نہ ہوئی۔" اور ہوتی بھی کیسے؟ کہ شعور و ادراک سے لے کر رُواں رُواں بدن بھی تو سربسجود تھا۔

درحقیقت تصوف وسلوک نام ہی اِس چیز کا ہے کہ نہ صرف زبانی اور عقلی طور پر اسلام کو مانے یا ایمان یا صورتِ عمل اختیار کرے بلکہ ایمان بھی حقیقی نصیب ہو، حقیقتِ عمل بھی نصیب ہو۔ عمل ترک نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی گہرائی اور گیرائی بڑھ جاتی ہے۔ ان نعمتوں کی حقیقی لذات وہی جانتے ہیں جنھیں نصیب ہوتی ہیں یا پھر اللہ کریم توفیق دے تو کر کے دیکھا جائے کہ یہ دولت تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور کفر پر اس کے دروازے بند ہیں۔ یہ بات درست نہیں کہ صرف چند لوگ یا چند خاندان ہی

حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نعمت موروثی نہیں ہے، کسبی ہے۔یعنی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے اور جو چیز کسبی ہوتی ہے اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ جو بھی محنت کرے حاصل کرسکتا ہے۔ ہاں کم زیادہ اللہ کی عطا ہے اور بندے کی استعداد ہے ورنہ ہے سب مسلمانوں کے لیے۔دُعا ہے بلکہ دِل سے دُعا نکلتی ہے کہ رب کریم تمام مسلمانوں کو نصیب فرمائے۔

میں نہیں جانتا میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں۔شاید اِس لیے کہ اِس نعمت پر نقل کی گرد بہت چڑھ گئی ہے اور بے وقوف تو نقل کے پیچھے بھاگ رہے ہیں جبکہ پڑھا لکھا طبقہ انکار میں گرفتار ہے۔لیکن یاد رہے! جہاں نقل ہوتی ہے وہ اِس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اصل بھی ہے۔تب ہی تو نقل بنی۔ اور نقل کو روکنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اصل کو عام کیا جائے۔ جب اصل دستیاب ہوگی تو کوئی نقل کے پیچھے کیوں جائے گا۔

اِس مراقبہ میں ایک دفعہ آیہ کریمہ دہرا کر جب روح سر بسجود ہو کر سجدہ کی تسبیح پڑھتی ہے تو جب تک مراقبہ کرتے رہیں گے وہ تسبیح دہراتی رہے گی۔ اچھا ہے اگر دل میں بھی دُہرائی جاتی رہے۔

# مراقبۂ فنا فی اللہ

اِس مراقبہ کی ابتدا آیہ کریمہ:

کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (الرحمٰن:۲۶)

سے ہوتی ہے۔ جب مراقبۂ عبودیت سے سر اُٹھا کر اس مراقبہ کے مقام پر متوجہ ہو کر اس آیہ کریمہ کی تلاوت کرتا ہے تو سالک خود کو مقامِ فنا میں پاتا ہے۔ جہاں ایک ایک کر کے کائنات کی چیزیں فنا ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، آسمان پھر پہاڑ، جنگل، درخت، دریا، سمندر، جاندار، بے جان، ہر شے فنا کی گھاٹی میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات، اپنا وجود بھی غائب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ روشنیاں تک غائب ہونے لگ جاتی ہیں۔ ہر طرف تاریکی چھانے لگتی ہے جو رفتہ رفتہ مکمل تاریکی کے ساتھ مکمل خاموشی بھی طاری کر دیتی ہے۔ کچھ باقی نہیں رہتا۔ قیامت کا منظر سامنے ہوتا ہے اور جس طرح کے مناظر قرآنِ حکیم نے بیان فرمائے ہیں وہ سب ایک ایک کر کے گزرتے اور ہر شے کو فنا کرتے چلے جاتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی ذات تک کی خبر نہیں رہتی۔ مخلوق

کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یوں سالک دنیا کی محبت سے نجات کا راستہ پاتا ہے۔

یاد رہے! دنیا میں رہنا ہے تو دنیا کو برتنا بھی ہے۔ کمانا، کھانا، پہننا منع نہیں۔ ہاں صرف لذاتِ دنیا میں کھو جانا درست نہیں۔ بلکہ تمام امور کو سنتِ خیر الانام ﷺ کے تابع کیا جائے تو سب دین ہو جاتا ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا یا اچھا گھر بنانا منع نہیں۔ اگر جائز وسائل اور رزقِ حلال سے بنایا جائے تو یہ ادائے شکر شمار ہوتا ہے۔ ایک شخص آپ ﷺ کے سامنے آیا تو بال پریشان، لباس بوسیدہ سا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ تو فرمایا بالوں کو درست کرو، اچھا لباس پہنو، صاف ستھرے رہو کہ یہ بھی ادائے شکر ہے۔ اِسی طرح فرمایا مومن جو اہل و عیال کو کھلاتا ہے، صدقہ شمار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جو خود کھاتا ہے، صدقہ شمار ہوتا ہے کہ سب اللہ کی اطاعت میں کرتا ہے۔ ہاں صرف کھانے پینے، پہننے اوڑھنے یا گھر اور گاڑی کے شوق میں اللہ کو بھول جائے اور ناجائز وسائل سے دنیا جمع کرنے لگ جائے تو یہ درست نہیں۔

مراقبۂ فنا میں دنیا اور اشیائے دنیا کی حیثیت سامنے آجاتی ہے۔ بھلا جس کا اپنا وجود فنا ہونے والا ہے اُس کی خاطر، مالک کریم کی نافرمانی کیوں کرے گا؟ اور یہی مقصود ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ پانی میں رہو مگر مرغابی کی طرح کہ جس کا جسم نہیں بھیگتا صرف پروں کے باہر پانی رہتا ہے۔ یا ایک مثال کشتی کی دی جاتی ہے کہ کشتی کو پانی ہی میں رہنا ہے مگر اس کی اپنی بقا اس بات پہ ہے کہ اس کے اندر پانی داخل نہ ہو۔ ورنہ غرق ہو جائے گی۔ یہی مثال دنیا کی ہے کہ رہنا تو دنیا میں ہے

اور یہیں سے آخرت کما کر لے جانی ہے مگر دل کے اندر حبِ دُنیا داخل نہ ہو جائے۔ ورنہ خود کو غرق کرو گے۔ تو سلوک وتصوف سارے کا سارا یہی ہے کہ ہر اگلا مراقبہ خلوص فی العمل میں زیادتی کا سبب بنتا چلا جاتا ہے۔ حضرت عبدالقادر گیلانی رحمتہ اللہ علیہ درآمد و برآمد فرمایا کرتے تھے جو بحری جہازوں پہ ہوتی تھی تو ایک روز اطلاع آئی کہ ہمارا جہاز جو سامان لا رہا تھا، وہ غرق ہو گیا ہے۔ آپ نے سکون کے ساتھ فرمایا الحمدللہ۔ کچھ وقت گزر گیا اور پھر اطلاع آئی کہ وہ خبر درست نہ تھی۔ غرق ہونے والا جہاز کسی اور کا تھا۔ ہمارا جہاز سلامتی سے بندرگاہ پہ پہنچ رہا ہے۔ آپ نے سکون سے سنا اور فرمایا۔ الحمدللہ۔ کوئی شخص جو پہلی اطلاع کے وقت بھی حاضر خدمت تھا اور اتفاق سے دوسری اطلاع کے وقت بھی موجود تھا، نے پوچھا حضرت ! آپ نے جہاز کے غرق ہونے کی اطلاع پر الحمدللہ کہا تو میں سمجھا شاید مال مشکوک ہوگا، جو غرق ہو گیا تو آپ نے شکر ادا کیا۔ مگر دوسری اطلاع پر کہ مال بخیریت پہنچ گیا ہے، آپ نے پھر الحمدللہ کہا۔ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا میں نے جہاز کے ڈوبنے یا تیرنے پہ الحمدللہ نہیں کہا بلکہ نقصان کی اطلاع پہ اپنے دل کو دیکھا تو اس پہ کوئی رنج نہ تھا۔ وہ اسی طرح متوجہ الی اللہ تھا۔ اس کی سلامتی پر میں نے اللہ کریم کا شکر ادا کیا اور جب مال پہنچنے کی اطلاع آئی تو میں نے قلب کو دیکھا تو کوئی اثر نہ تھا۔ لہٰذا میں نے اللہ کریم کا شکر ادا کیا کہ دل اللہ سے مشغول اور دنیا کے نفع نقصان سے بالاتر ہے۔

اِن مراقبات سے یہ نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اور جب دنیا اور مال ومنالِ دنیا کی حقیقت سمجھ میں آتی ہے تو ان کی چمک آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی۔ نیز یہ باتیں ہم

کتابوں میں بھی پڑھتے ہیں اور اہلِ علم سے سنتے بھی ہیں مگر بات نہیں بنتی۔ ہاں جب یہ کیفیات قلوب پہ وارد ہوتی ہیں تو اُن کا اثر عجیب ہوتا ہے۔ سنی سنائی بات دوا کی طرح ہوتی ہے۔ جو کھائی جاتی ہے، نظامِ ہضم میں جاتی ہے، پھر اجزائے بدن میں تھوڑا تھوڑا اثر پیدا کرنا شروع کرتی ہے۔ لیکن ٹیکہ لگایا جائے تو سیدھا خون میں شامل ہو کر فوری اثر کرتا ہے۔ ایسے ہی یہ کیفیات سیدھی دل میں پہنچتی ہیں۔ عقل وخرد کے نظام کی چھلنی میں نہیں پڑتیں اور دل کو پورے خلوص کے ساتھ اطاعتِ الٰہی کی طرف مائل کرتی ہیں۔

# مراقبۂ بقا باللہ

اس مراقبہ کی تسبیح ہے:

وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (الرحمٰن:۲۷)

یہ مراقبہ اِسی آیہ کریمہ کے تحت کیا جاتا ہے اور یہی اس کی تسبیح بھی ہے۔ جب اس مقام میں داخل ہوتے ہیں تو یوں نظر آتا ہے کہ انوارات آنا شروع ہو گئے ہیں حتیٰ کہ رفتہ رفتہ سارا عالم انوارات سے بھر جاتا ہے اور پھر سے ہر شے اپنے مقام پر نظر آنے لگتی ہے۔ مگر عجیب بات جو ہوتی ہے وہ یہ کہ ہر شے انھیں بقا کے انوارات کی مدد سے قائم ہے۔ اور ہر چیز تک بقا کے انوارات پہنچ رہے ہیں۔ گویا ذاتی طور پر کوئی بھی شے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ جب تک اللہ کریم چاہتا ہے اِسے قائم رکھتا ہے اور جب وہ اپنی تائید یعنی انواراتِ بقا سلب فرما لیتا ہے شے کا وجود مٹ جاتا ہے۔ اِسی مقام پر شیخ ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ نے فلسفہ وحدت الوجود دیا کہ وجودِ حقیقی صرف حق تعالیٰ جل شانہ کا ہے۔ باقی سب اُس کی قوت پر یا اُس کے قائم رکھنے پر قائم ہے۔

یہی مراد تھی وحدت الوجود کی۔ مگر بعد میں غلط تاویلات کی گئیں اور مطلب بالکل اُلٹ گیا کہ ہر شے ہی اللہ ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ کیسی عجیب بات ہے کہ بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا۔ پھر اللہ کریم نے یہ اعزاز حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کو بخشا اور انھوں نے اس کی اصلاح فرماتے ہوئے فرمایا کہ اِسے وحدت الشہود کہا جائے کہ ہر چیز اُس ذات وحدہ لاشریک کی عظمت پر گواہ ہے کہ اُس کے قائم رکھنے سے اِس کی ذات بھی قائم ہے اور صفات بھی۔ اگر اُس کی تائید سے محروم ہو تو پھر کسی شے کی نہ ذات باقی، نہ صفات۔ یہ بہت خوب صورت بات ہے۔ اِس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ بے شمار حضرات نے اِس موضوع پر بہت لکھا اور کتب تصنیف ہوئیں، بحثیں ہوتی رہیں مگر مسئلہ بجائے سلجھنے کے اُلجھتا رہا اور ایک عام آدمی کی سمجھ سے بات بالا تر ہی رہی۔ حق یہ ہے کہ بات کرنے والے بھی صوفی تھے، اسے سمجھانے کے لیے بھی صوفی ہی کی ضرورت ہے اور سمجھنے کے لیے بھی تصوف سے تعلقِ خاطر کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ غیر صوفی کے پاس تو الفاظ کے کھلونے ہوتے ہیں۔ جن سے وہ مختلف کھیل کھیلتا ہے۔ مقصد اور مفہوم تک رسائی مشکل ہوتی ہے۔ اس کی تشریحات لکھنے والے تو بڑے بڑے صوفی تھے مگر سمجھنے والے اور بعد میں ان تصنیفات کو پڑھنے والوں کی اکثریت اِس فن سے آشنا نہ تھی۔ لٰہذا بہت کچھ پڑھنے کے باوجود خود نہ سمجھ سکے تو عوام کو کیا خاک سمجھا پاتے۔ یوں مسئلہ ابھی تک بحث مباحثے کا سبب بنا ہوا ہے۔ حالانکہ بڑی سادہ سی حقیقت ہے جس کا اظہار ابنِ عربی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ مگر بعد والوں نے، جو تصوف سے آشنا نہ تھے اس کی تاویلات بدل دیں۔ پھر حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ

نے وحدت الوجود سے بدل کر اُسے وحدت الشہود کا نام دے کر تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا۔

ع انھیں کے کام ہیں یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

یہی، یعنی فنا، بقا، وہ مقام ہے کہ اس پر لوگ مجذوب ہو گئے اور حواس گم کر بیٹھے اور بعض نے عجیب وغریب نعرے لگائے اور بعض نے سزائیں بھی پائیں۔ اگر یہ مراقبہ عرصہ دراز تک رہے اور بندہ مجاہدہ کرنے والا ہو تو اِس کی کیفیات حواس کو مختل کر دیتی ہیں۔ اِس حالت کو حالتِ جذب اور ایسے بندے کو مجذوب کہا جاتا ہے۔ شریعت میں اِس کے لیے رعایت یہ ہے کہ جب حواس کام نہیں کرتے تو بندہ شریعت کا مکلّف نہیں رہتا لہٰذا اِن کے بارے سکوت کیا جائے اور ان کا معاملہ اللہ کریم کے سپرد کر دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ مجذوب سے کسی کو فائدہ ہوگا! تو یہ سوچنا ہی فضول ہے۔ جس بندے کو اپنے بھلے برے کی تمیز نہیں وہ بھلا دوسروں کے بارے کب اور کیا سوچے گا۔ ہاں مشائخ حضرات مبتدی طالبوں کو ان کے قریب تک جانے سے منع فرماتے تھے کہ ان سے کمزور درجے کا بندہ اگر پاس جائے گا تو اس کے انوارات ان کے انوارات میں سلب ہو جاتے ہیں۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ پانی کی نالی بہہ رہی ہو اور اوپر سے دریا گزر جائے تو وہ کیا باقی رہے گی۔ ایک واقعہ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ بھی پیش آیا کہ ایک دفعہ ایک شخص ذِکر سیکھنے کے لیے حاضر ہوا اور ذکر کے بعد کہنے لگا کہ حضرت! مجھے پہلے انوارات نظر آتے تھے، آپ نے اور دینے کے بجائے میرے پہلے بھی سلب کر لیے تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ بات تو نے پہلے

کیوں نہ بتائی۔ میں اِس کا خیال رکھتا۔ تمہارے انوارات تو محض مجاہدے کے تھے، شیخ کی توجہ سے راسخ نہ تھے لہٰذا اَب وہ دریا کی نظر ہوئے۔ اَب محنت کرو اور اَب حاصل ہوں تو پھر کسی سے کہنا سلب کر کے دکھائے۔ لیکن یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ ہر پاگل، مجذوب نہیں ہوتا۔ یہاں تو پیدائشی پاگلوں کو بھی مجذوب مان لیا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ مجذوب وہ لوگ ہوتے ہیں جو راہِ سلوک کے مسافر ہوتے ہیں اور عموماً فنا، بقا پر تادیر رہنے سے مجذوب ہو جاتے ہیں اور حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں منصور حلاج رحمتہ اللہ علیہ کا ذکر چھڑا تو فرمانے لگے میرے زمانے میں ہوتا تو میں اُسے توجہ دے کر فنا، بقا سے آگے لے جاتا اور وہ مجذوب نہ ہوتا۔ ہاں وقتی طور پر جذب کا وارد ہو جانا اور لمحاتی طور پر مجذوبیت طاری ہو جانا، یہ سب صوفیوں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

یاد رہے! مجذوب ہونا کمال نہیں بلکہ نقص کی دلیل ہے۔ اِس لیے کبھی کوئی نبی مجذوب نہیں ہوتا بلکہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر وقتی، لمحاتی جذب بھی وارد نہیں ہوتا۔ مگر اُمتی میں وہ قوت برداشت نہیں ہوتی لہٰذا پوری اُمت میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کبھی جذب وارد نہیں ہوا۔ ورنہ اُن کے بعد افضل ترینِ اُمت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بھی چند لمحے جذب وارد ہو گیا تھا کہ وصالِ نبوی ﷺ پہ تلوار نکال لی اور فرمایا جس نے کہا حضور اکرم ﷺ کا وصال ہو گیا ہے اُس کی گردن مار دوں گا۔ مگر جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور یہ آیہ کریمہ تلاوت فرمائی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران:۱۴۴)

تو ہوش میں آ گئے۔ تلوار نیلام میں کر لی۔ تو پھر اور کسی کی کیا حیثیت ہے مگر اصول یہ ہے کہ جذب کمال نہیں ہے۔ اگر کمال ہوتا تو انبیاء کو عطا ہوتا۔ لہٰذا وقتی اور لمحاتی طور پر جذب کا وارد ہونا اور بات ہے اور مستقل مجذوب ہو جانا اور بات۔ اور یہ خاص طور پر یاد رکھا جائے کہ نہ تو مجذوب سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور نہ اس کا اتباع کیا جا سکتا ہے۔

چونکہ یہ مراقبات بہت قوی ہوتے ہیں لہٰذا انھیں برداشت کرنے کا حوصلہ بھی اللہ کریم ہی عطا فرماتے ہیں۔ ان کا اثر عملی زندگی پر بڑا عجیب ہوتا ہے کہ دل فانی کی طلب سے بے نیاز ہو کر باقی کی محبت کا اسیر ہو جاتا ہے۔ یوں عبادت اور اعمال میں اتباعِ شریعت بوجھ نہیں لگتا بلکہ غذا بن جاتا ہے اور حق پر عمل کے بغیر چین نصیب نہیں ہوتا۔ یہ سب باتیں جاننے اور تجربے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اللہ کریم سے توفیق طلب کرے اور کر کے دیکھے تو اِس سے آگے اِسی کا حصہ ایک اور مراقبہ ہے۔ فناء الفناء۔ اس میں کیفیات کی گیرائی اور گہرائی بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ نے شاید چند لوگوں کو کرایا ہوگا۔ سب کے لیے ضروری نہیں۔ فقیر بھی احباب کو یہ مراقبہ نہیں کراتا، سوائے ایک دو کے۔ لہٰذا اِس کے بارے لکھنا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اللہ کریم کا احسان ہے کہ اِس کے ساتھ مراقبۂ سیرِ کعبہ، فنا فی الرسول ﷺ اور مراقبۂ مسجدِ نبوی ﷺ کرایا جاتا ہے۔ جس کے بارے میں ان شاء اللہ ضرور لکھا جائے گا۔ مگر یہ اگلے مراقبات (مراقبات فنا، بقا)، مراقباتِ ثلاثہ یعنی اقربیت تک مراقبات کرا کے بھی کرائے جا سکتے ہیں۔ اگر محض مراقباتِ ثلاثہ تک لکھنے کا ارادہ ہوتا تو سیرِ کعبہ اور

روضۂ اطہر اور مسجدِ نبوی کے مراقبات کے بارے ساتھ ہی لکھ دیتا۔ لیکن ارادہ بفضل اللہ فنا، بقا تک لکھنے کا تھا کہ ''رموزِ دل'' میں وہاں تک نشاندہی کر دی گئی تھی لہٰذا اسے مسلسل لکھتا گیا۔

ایک اور بات! کہ اکثر حضرات نے فنا، بقا کو انتہا سمجھا ہے اور اکثر سلاسل میں یہاں تک بھی رسائی بہت مشکل ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ مگر نسبتِ اویسیہ میں فنا، بقا تک کے مراقبات کو سلوک و تصوف کی ابجد قرار دیا جاتا ہے۔ جیسے ہر زبان کے ابجد ہوتے ہیں۔ جو گنتی کے حروف ہوتے ہیں اور پھر اہلِ زبان میں کیسے کیسے لوگ کن عظمتوں پہ جاتے ہیں۔ یہی مقام ان مراقبات کا ہے۔ نسبتِ اویسیہ کے قریب جسے فنا، بقا تک کے مراقبات نصیب ہو جائیں سمجھا جاتا ہے کہ اُسے ابجد از بر ہو گئے۔ اَب اِسے آگے پڑھایا جا سکتا ہے۔ یوں اس کے اگلے اسباق شروع ہوتے ہیں۔ جن کے بارے شاید لکھنے کی جرأت نہ کر سکوں بلکہ یہ میدان اُن لوگوں کے لیے چھوڑتا ہوں جنھیں توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے۔

یہ فلسفہ کہ سلوک تمام ہو گیا، بنیادی طور پر غلط ہے۔ سلوک نام ہے قربِ الٰہی کی کیفیات کا جو عہدِ نبوی ﷺ میں ایک نظر میں نصیب ہو جاتی تھیں۔ وہ تمام لوگ جنھیں صحبتِ نبوی ﷺ نصیب ہوئی، صحابی قرار پائے۔ جبکہ عظمتِ صحابہؓ کا اندازہ غیر صحابی نہیں کر سکتا۔ اگر دنیا بھر کے سارے لوگ ولایت کے بلند ترین مقامات کو پالیں تو صحابیؓ کی خاکِ پا کو نہیں پہنچ سکتے۔ تو جب صحابہؓ کے لیے بھی ارشاد ہے:

زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال:۲)

کہ ان کے ایمان ویقین میں زیادتی ہوتی ہے۔

تو پھر ولی نے کیسے انتہا کو پالیا۔ بلکہ یہ تو ایک مسلسل عمل ہے اور عطائے باری ہے۔ جس کی حد ہے نہ انتہا۔ یہ ترقی دارِ دنیا میں ہوتی رہتی ہے۔ برزخ میں چونکہ عمل ختم ہوجاتا ہے تو ترقیٔ منازل تو رُک جاتی ہے۔ مگر کیفیات میں گہرائی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ دو باتیں ہیں۔ ایک مراقبات میں ترقی اور دوسرے کیفیات میں زیادتی کہ اُسی منزل پر رہ کر کیفیات میں ترقی ہوتی رہے۔ یہ برزخ میں بھی جاری رہتی ہے۔ اللہ ﷻ کے بندوں کو عرصہ محشر میں نصیب ہوگی اور جنت میں بدستور ہر آن پہلے سے بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ حضرت ابو یزید رحمتہ اللہ علیہ کا قول ''حلیۃ الاولیا'' میں نقل ہے۔ جس کا مفہوم ہے کہ اللہ ﷻ کے کچھ خاص بندے ایسے ہیں کہ اگر جنت میں ان کے سامنے کوئی حجاب آجائے تو اِس طرح فریاد کریں گے جیسے دوزخی، دوزخ سے نکلنے کے لیے فریاد کریں گے۔ یعنی حجاب نہیں آئے گا، نہ وہ برداشت کر پائیں گے۔ اور كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (الرحمٰن:۲۹) کا نظارہ کرتے رہیں گے۔ گویا جنت میں بھی مسلسل ترقی ہوتی رہے گی اور ابدالآباد ہوتی رہے گی۔ پھر کوئی کیسے کہہ سکتا ہے کہ سلوک تمام ہوگیا۔ ہاں یہ ربِ جلیل کی عطا ہے کہ کس کو کہاں تک استعداد، شعور اور جرأتِ علم عطا کی۔

مراقباتِ فنا، بقا کی کیفیات سالک کے لیے زندگی ایسے ہی بنا دیتی ہیں کہ وہ دنیا میں رہتا ہے مگر دنیا اُس کے اندر نہیں بستی بلکہ اس کا باطن تجلیاتِ باری کا مرکز، اس کی اُمیدیں وصالِ الٰہی اور اس کی محبت اللہ ﷻ اور اس کے رسول ﷺ سے ہوا کرتی

ہے۔ دورانِ ملازمت ہمارے ایک ہیڈ ماسٹر صاحب ہوا کرتے تھے۔ شاہد صاحب۔۔۔ انھوں نے ایک شعر کہا تھا:

ہٹ جاؤ طبیبو، نہ کرو میری دوا تم
شاید وہ قبر میں ہی گلے آن لگا لے

فقیر اَب تک اِس شعر کا لطف لیا کرتا ہے۔ شاید یہ مفہوم، جو فقیر کے ہاں ہے، خود شاعر کو بھی معلوم نہ ہو۔ کیسی عجیب بات ہے کہ مالک نے جس طرح رات میں دن کو رکھا ہے کہ اس کے بعد ضرور آتا ہے۔ اسی طرح فنا کے بعد بقا کو رکھا ہے۔ کوئی اُس کی طلب میں فنا ہو کر دیکھے، کس طرح بقا کو پاتا ہے۔ یہ بہت ہی عجیب کیفیات ہیں جو حقیقتاً تجربہ کرنے اور آزمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کیفیات کو لکھنے کے لیے واضع نے حروف و الفاظ وضع نہیں فرمائے تو کوئی انھیں کیسے لکھ سکتا ہے۔

ہاں مراقباتِ فنا، بقا حاصل ہونے پر ایک میدان فراہم ہو گیا اور اس میں عمارت بنانے کی بنیاد فراہم ہوگئی۔ الحمد للہ، اگر اللہ کریم کرم فرمائے تو آگے کام ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں کی ایک ایک اینٹ جان ہار کر میسر آتی ہے۔ ہزاروں خواہشیں دم توڑتی ہیں تو گارا بنتا ہے۔ یہ صرف عطائے الٰہی سے ممکن ہے اور اس کی طلب کے لیے قلبِ منیب درکار ہے۔ اللہ جسے چاہے عطا کر دے۔ اِس کے عجائبات شمار میں نہیں آسکتے۔ فقیر نے ممکن حد تک تو شاید بہت لکھ دیا، اَب دیکھیں کس کو کہاں تک خبر ہوتی ہے یا یہ تحریر بھی کاغذ و سیاہی کا ضیاع بنتی ہے۔ اِن علوم کی بنیاد تو قرآن کریم میں

ہے۔ مفسرینِ کرام نے ان سب پر روشنی ڈالی، پھر بزرگانِ دین نے ہر عہد میں اِن پر بہت اور بہترین لکھا مگر لطائف، انوارات کے رنگ وغیرھا تو کتابوں میں ملتے ہیں لیکن ان کی کیفیات، واردات اور عملی زندگی سے ان کا رشتہ کم اَز کم فقیر کی نظر سے نہیں گزرا، نہ علم میں آیا۔ ہر دور کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور رب کریم جس سے چاہے، جو چاہے خدمت لے سکتا ہے۔ شاید یہ خدمت فقیر کے نصیب میں تھی۔ زندگی میں اور تو کچھ نہ کر سکے۔ شاید یہ حروف باعثِ نجات بن جائیں کہ اُس کریم کا سمندر ناپیدا کنار ہے اور اس کی بخشش بے حد و حساب ہے۔ ہاں یہ اللہ جلّ جلالہٗ کریم کا احسان ہے کہ فقیر صرف لکھنے، بات کرنے کی حد تک نہیں بلکہ جو حاصل کرنا چاہے اُسے تعلیم بھی کر سکتا ہے کہ اللہ کریم نے یہ نعمت عطا کی اور مشائخ عظام اور حضرت اُستاذ المکرّم رحمتہ اللہ علیہ نے اِس کی اجازت فرمائی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (الجمعۃ: ۴)

# مراقبۂ سیرِ کعبہ

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ مراقبہ، مراقباتِ ثلاثہ کے بعد کرا دیا جاتا ہے۔ اِس میں سالک کی روح خود کو بیت اللہ شریف کے سامنے کھڑا پاتی ہے اور تلبیہات پڑھ رہی ہوتی ہے۔ اِس میں بیت اللہ شریف تو نظر آتا ہے مگر گردا گرد حدِ نظر تک ارواح کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور بے شمار ارواح، جو دارِ دنیا سے تو جا چکیں مگر یہ مرتبہ اُنھیں حاصل تھا، مصروفِ طواف ہوتی ہیں جدید عمارتوں اور شہر وغیرہ کی خبر نہیں ہوتی جدھر دیکھو ارواح ہی ارواح نظر آتی ہیں۔

دراصل بیت اللہ شریف دنیا کا مرکز ہے اور تجلیاتِ ذاتی کا مہبط ہے۔ اِس کے انوارات عالمِ امر سے آتے ہیں۔ جو عالمِ خلق یعنی نو عرشوں سے بھی اوپر ہے اور نیچے جاتے ہوئے عالمِ خلق سے گزر کر آسمانوں اور عرشوں سے گزرتے ہوئے عالمِ امر سے جا ملتے ہیں۔ یہ تجلیات ذاتی ہوتی ہیں مگر ہر بندے کی قبولیت کی استعداد اپنی ہوتی ہے۔ کون، کس قدر روشنی پاتا ہے یہ اس کی استعداد پہ منحصر ہے۔ یہ کیفیت مادی طور پر

بھی یوں محسوس کی گئی ہے کہ فقیر کی ملاقات امریکہ میں مقیم ایک مصری فائیٹنگ پائلٹ سے ہوئی۔ جو مصر اور اسرائیل کی مشہور جنگ میں (جس میں مصر نے اسرائیل کو بھگا دیا تھا) شامل تھا۔ اُس نے بتایا کہ ٹریننگ میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ کعبۃ اللہ کے عین اوپر کسی بھی صورت جہاز کو نہ لے جایا جائے۔ کہ جہاز اگر عین کعبہ کے اُوپر سے گزرے تو اُس کے الیکٹرونک گیجٹس خراب ہو جاتے ہیں اور پھر پائلٹ کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے؟ اَب وہ کہاں ہے؟ اور کس سمت کو جانا ہے؟ ظاہر ہے کہ اِس کی وجہ وہی، انوارات کی قوت ہے جو بیت اللہ شریف پر وارد ہوتے ہیں۔ وہاں حاضر ہونے والا ان سے اس طرح سے مستفید ہوتا ہے کہ حدیث شریف کے مطابق حج کرنے والا گناہوں سے اِس طرح پاک ہو جاتا ہے جیسے آج پیدا ہوا ہو۔ ہاں یہ نصیب اُنھیں کو ہوتا ہے جن کا عقیدہ درست ہوتا ہے اور وہ ایمان و یقین کے ساتھ طواف کرتے ہیں۔ گناہ معاف ہو جانے سے مزاج بدل جاتا ہے اور پھر گناہ سے نفرت اور نیکی سے رغبت ہو جاتی ہے اور یوں جب حج سے واپس آتا ہے تو ایک نیا انسان ہوتا ہے۔

اِسی طرح سیرِ کعبہ میں جن ارواح کو حاضری نصیب ہوتی ہے، ان انسانوں کا مزاج بدل جاتا ہے اور مزاج کی یہ مثبت تبدیلی پورے کردار کو متاثر کرتی ہے۔ اس میں روح بیت اللہ شریف کے سامنے کھڑے ہو کر تلبیہات پڑھتی ہے۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ساتھ بندہ دل میں بھی دہراتا رہے تو بہت اچھا مگر اکثر اوقات اِس قدر توجہ مراقبہ کی طرف ہو جاتی ہے کہ سب خاموش رہ جاتے ہیں۔ مگر وہاں روح دُہراتی رہتی ہے۔

# سیرِ صلوٰۃ

اِسی مراقبہ میں سیرِ صلوٰۃ بھی کرائی جاتی ہے۔ سیرِ صلوٰۃ میں نماز کے لیے تکبیر کہی جاتی ہے تو صفیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ حدِ نظر تک ہر سمت صفیں بن جاتی ہیں۔ جنھیں اُس وقت کا شیخ دوگانہ پڑھاتا ہے۔ عموماً یہی ہوتا ہے اور گاہے یہ بھی ہوتا ہے کہ مشائخِ بالا میں سے کوئی ہستی نماز پڑھا دے۔ نصیب کی بات ہے۔ نصف صدی کے دوران یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہو چکا فقیر کو ایک بار یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آقائے نامدار ﷺ نے دوگانہ پڑھایا۔ عموماً بہت کم اتفاق ہوتا ہے کہ مشائخِ کرام میں سے بھی کوئی پڑھائے ہاں شیخِ وقت، دنیا میں جو سب سے بلند منازل والی ہستی ہوتی ہے، وہ امامت کرتی ہے۔ اِس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عالم میں روح کو وہاں لے جا کر اتنے مقبول بندوں کے ساتھ، تجلیاتِ ذاتی کی بارش میں کھڑا کیا جائے یا رکوع وسجود نصیب ہوں تو اِس میں کس قدر روشنی اور برکات ہونی چاہئیں اور اس سے عملی زندگی میں کیسی خوب صورت تبدیلی آنا چاہیے۔ یہ سالکین کے لیے خود کو پرکھنے کا ایک خوب صورت معیار بھی ہے۔ لہٰذا سالکین کو اِن باتوں پر خصوصی توجہ دینا ضروری ہے کہ اِس سب کا مقصد عملی زندگی میں خوب صورت تبدیلی اور اطاعتِ الٰہی پر کاربند ہونا ہے۔ وہاں کی حاضری، ایک ایک تسبیح اور رکوع وسجود کیا کیا عطا کرتا ہے؟ اِس کا اندازہ صرف عملی زندگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ورنہ کتنے پتھر شیریں پانیوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور اُن پر کچھ نہیں اُگتا۔ اسی طرح کتنے بے حس وجود، بدن اور رُوح سمیت

وہاں سے ہو کر آ جاتے ہیں مگر عملی زندگی میں تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ اللہ کریم کی خصوصی عطا ہے کہ کوئی ایسی ہستی نصیب ہو جائے جو اِس عالمِ آب و گل میں روح کو یہاں سے اُٹھا کر بالائے آسمان اور وہاں سے بیت اللہ شریف پہنچا دے تو سبحان اللہ! اس کے بعد مزید کیا تمنا کی جا سکتی ہے۔

## سیرِ قرآن

سیرِ صلوٰۃ کے بعد سیرِ قرآن کا مراقبہ، جو اسی کا حصہ ہے، کرایا جاتا ہے۔ جب شیخ حکم دیتا ہے "سیرِ قرآن" تو سب قرآن حکیم میں سے جہاں سے چاہیں چند آیات تلاوت کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ جس میں قرآن کریم کے انوارات، رُوح اور قلب کی گہرائی تک، اُترتے اور اثر کرتے چلے جاتے ہیں۔ عجیب منظر اور نرالا لطف ہوتا ہے۔

اِس کے بعد دُعا کے لیے کہا جاتا ہے اور ہر کوئی دست بدعا ہو جاتا ہے۔ اپنے لیے، اپنوں کے لیے، ملک و قوم اور دین کی سربلندی کے لیے، دُنیا و آخرت کی بہتری کے لیے، یعنی سالک جو چاہے اللہ کریم سے مانگے۔ مگر یاد رہے! دُعا، دُعا ہوتی ہے۔ حکم نہیں کہ دُعا مانگنے والا جو مانگ رہا ہے ضرور ایسا ہی ہو جائے۔ ہاں دُعا کی عظمت یہ ہے کہ اللہ کریم سے گزارشات پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کبھی دُعا ہو بہو پوری ہو جاتی ہے اور کبھی پوری تو ہو بہو ہوتی ہے مگر تاخیر سے۔ یعنی کچھ وقت درمیان میں آ جاتا ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے

کہ جو مانگ رہا ہوتا ہے وہ اس کے حق میں بہتر نہیں ہوتا تو اُسے بہتر سے بدل دیا جاتا ہے۔اور کبھی اُس کی دُعا اللہ کریم اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔عرصۂ محشر میں جب اعمال ترازو پہ رکھے جائیں گے تو ارشاد ہوگا ٹھہرو! اس کے کچھ اعمال میرے پاس ہیں۔ انھیں بھی نیکی کی طرف رکھو۔تو وہ دعائیں جو اللہ کریم کے پاس ہوں گی،عطا کی جائیں گی۔جو پلڑے کو بہت بھاری کردیں گی۔اُس وقت بڑے بڑے مقبول الدعوات آرزو کریں گے کہ کاش دنیا میں کوئی دعا پوری نہ ہوئی ہوتی اور آج کام آتی۔ یہ اللہ کریم کی بہت بڑی عطا ہے کہ یہ نعمت نصیب ہو جائے۔ چنانچہ دُعا پر اِس مراقبہ کی تکمیل ہوتی ہے اور یہاں سے فنا فی الرسول میں روضۂ اطہر پہ حاضری کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور شیخ توجہ دے کر فرماتا ہے،روضۂ اطہر۔تو سالکین کی ارواح شیخ کی رُوح کے ساتھ پرواز کرتی ہوئی روضۂ اطہر پہ حاضر ہوتی ہیں۔

# مراقبۂ روضۂ اطہر

سیرِ کعبہ سے روضۂ اطہر پہ توجہ دی جاتی ہے اور سالک کی رُوح روضۂ اطہر پہ اندر حاضر ہوتی ہے کہ برزخ میں اس کی رسائی ہوتی ہے۔ جہاں حضور اکرم ﷺ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ کی شایانِ شان جگہ ہے۔ آپ کے بائیں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بائیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ روشنی سبز اور انوارات کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ سالک کی روح میں انوارات اُترتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ بدن تک انھیں محسوس کرتا ہے اور رُوح میں بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ اصول ہے کہ اگر کوئی محض بدن ہی کی پرورش پہ لگا رہے تو روح کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس طرح بدن کی غذا مادی ہے ایسے ہی روح کی غذا ذکر الٰہی اور برکاتِ نبوت ہیں۔ جس طرح بدن کو صحت مند رہنے کے لیے مادی غذا اور دوا چاہیے

اُسی طرح روح کی ضرورت ہے کہ اُسے غذا و دوا دی جائے۔ جو لوگ عمر بھر صرف بدن پالنے پر لگے رہتے ہیں اُن کی ارواح کمزور ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات مر جاتی ہیں۔ روح کی موت سے مراد اُس کا ایمان سے خالی ہو جانا ہے۔ آج تو یہ بات عام ہے کہ اچھے بھلے دیندار اور شریف گھرانوں میں پیدا ہونے والے لوگ گمراہ ہو رہے ہیں۔ کوئی، کسی باطل عقیدے کا شکار ہو جاتا ہے تو کوئی سرے سے ہر بات کا منکر۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ روح کی زندگی اور صحت کی طرف توجہ نہ دی گئی اور وہ سسک سسک کر مر گئی۔ کچھ لوگوں میں ایمان باقی ہوتا ہے۔ مگر بہت کمزور کہ انھیں برائی سے روک نہیں سکتا۔ گویا ان کی روح اس قدر کمزور ہوتی ہے کہ بدن کو اس کی ناجائز خواہشات کی تکمیل سے روک نہیں سکتی اور یہ مشاہدہ اکثر لوگوں میں کیا جا سکتا ہے کہ بظاہر نماز، روزہ ہی نہیں، حج اور عمرے بھی کرتے رہیں گے مگر معاملات میں اصلاح نہ ہوگی۔ حتیٰ کہ سود تک کھاتے رہیں گے۔ اَب جو شخص سود کھا سکتا ہے، وہ کسی کا بھی حق مار سکتا ہے۔ اور یہ مثالیں آج ہمارے معاشرے میں عام ہیں لیکن اگر روح کی حیات اور صحت کا خیال رکھا جائے تو اس کے لیے پہلی بات تو عقیدہ کا درست ہونا ہے، پھر ذکرِ الٰہی کا نصیب ہونا، جو شیخ کی توجہ سے نصیب ہوتا ہے کہ شیخ کی توجہ برکاتِ نبوت کی حامل ہوتی ہے۔ چنانچہ روح میں صرف حیات ہی نہیں قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور قوتِ پرواز حاصل کر کے عالمِ بالا تک رسائی پاتی ہے اور یوں سیرِ کعبہ سے ہوتی ہوئی بارگاہِ رسالت پناہی میں حاضر ہوتی ہے۔

تمام مراقبات رُوح کی قوت اور حیات کا سبب بنتے ہیں اور ہر ایک مراقبہ جدا

جداٹا نک (Tonic) کا کام کرتا ہے۔ جوں جوں روح قوت حاصل کرتی ہے توں توں خواہشاتِ نفس کی بجائے بدن بھی احکامِ الٰہی کی تکمیل کرتا ہے اور یہی تو مقصود ہے۔

چنانچہ جب روح روضۂ اطہر پہ اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں پہنچ گئی تو گویا وہ چشمۂ آبِ حیات پہ پہنچ گئی۔ اَب اس کے بعد دنیا میں کوئی بڑی دوا، غذا یا خزانہ نہیں۔ یہاں سے سیراب ہوکر وہ اپنی حقیقی حالت میں ڈھل جاتی ہے کہ اس کی اصل تو عالمِ امر سے تھی اور وہ صاف ستھری جب مادی وجود میں داخل کی گئی تو پھر وجود نے خواہشاتِ نفس کی تکمیل میں اطاعتِ الٰہی کی پرواہ نہ کی۔ لہٰذا اس کے اثرات رُوح کو نہ صرف داغدار کرتے رہے بلکہ کمزور تر بھی کرتے رہے اور بعض اوقات رُوح کی موت ہوگئی اور بندے مرتد اور گمراہ ہوگئے۔ مگر جن خوش نصیبوں کو توفیقِ ذِکر نصیب ہو گئی اور کسی خضرِ راہ کی راہنمائی مل گئی تو وہ واپسی کے سفر پہ چل پڑے اور یوں رفتہ رفتہ فنافی الرسول سے سرفراز ہوکر چشمۂ آبِ حیات پہ رسائی پائی اور حیاتِ روحانی اس قدر طاقتور ہوئی کہ عقل وخرد سے لے کر دورانِ دل تک اور آنکھ کان سے لے کر ہاتھ پاؤں تک ہر شے کو اطاعتِ الٰہی پہ کاربند کر دیا اور بتقاضائے بشریت اگر کبھی خطا ہوگئی تو اِس قدر درد سے اور خلوص سے توبہ کی کہ اس کا ازالہ ہوگیا۔

یاد رہے! جب تک انسان اِس دنیا میں ہے وہ آزمائش میں ہے اور اس کی احتیاط ہر لمحہ ضروری کہ بقول کسے:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از راہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہ بعض لوگ ایسے بد بخت ہوتے ہیں کہ شیخ انھیں مانندِ خضر، آبِ حیات پر بھی لے جائے تو پیاسے لوٹتے ہیں۔ سو جب تک دنیا میں حیات ہے امتحان ہے۔ کسی لمحے یا کسی مقام پہ جہاں ذرا خلوص ڈگمگایا یا دنیا، شہرت یا دولت کا لالچ آیا تو پھر ادھر سے اُسے نکال دیا جاتا ہے بلکہ دھتکار دیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی بد نصیب کے ساتھ ایسا ہو تو پہلے سے بہت بدتر انسان ثابت ہوتا ہے کیونکہ اصول ہے کہ جو جتنی بلندی سے گرتا ہے اتنی زیادہ چوٹیں لگتی ہیں اور اتنا زیادہ زخمی ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات مر جاتا ہے۔ اللہ کریم معاف فرمائے۔ فقیر نے لوگوں کو گرتے بھی دیکھا ہے اور مرتے بھی کہ زندگی کی آزمائش تو موت آجانے تک جاری ہے۔ انا میں گرفتار ہو جانا کہ میں بہت پارسا ہوں، بہت بڑا بزرگ ہو گیا ہوں یا دوسروں کو حقیر سمجھنے لگ جانا یا دُنیا کے مفاد میں لگ جانا تو یہ ایسی باتیں ہیں جو وہاں زیب نہیں دیتیں۔ لٰہذا وہ برکات سلب ہو جاتی ہیں اور بندہ اوندھے منہ گرتا ہے۔ اللہ کریم اپنی پناہ میں رکھے۔ لیکن اکثریت بفضل اللہ سلامت رہتی ہے اور انھیں حفاظتِ الٰہیہ نصیب ہوتی ہے۔ وہ زندگی کا مقصد اطاعتِ الٰہی بنا لیتے ہیں۔ اس کی خاطر زندہ رہتے ہیں اور اس کی خاطر جان بھی دے دیتے ہیں۔ یہ عجیب لوگ ہوتے ہیں کہ صبح شام اس بارگاہ کی حاضری سے مشرف ہوتے ہیں اور برکات حاصل کرتے ہیں لیکن پھر بھی وہاں کے راز عجیب ہیں، آشکارا نہیں کیے جا سکتے۔ نہ یہ جرأت ہی اللہ کریم دے۔ ہاں اشارات کیے دیتا ہوں کہ بعض کو اپنی حاضری کا احساس ہوتا ہے اور بعض کو صرف انوارات نظر آتے ہیں۔ بعض کو حضرات کے تشریف رکھنے کی سمجھ آتی ہے اور بعض کو گاہے زیارت بھی نصیب

ہو جاتی ہے۔ بعض خوش نصیبوں کو اشاراتِ عالیہ سے بھی نوازا جاتا ہے، مگر بہت ہی کم۔ ہاں قدرِ مشترک یہ ہے کہ سب کو نیکی سے رغبت اور پیار ہو جاتا ہے مگر پھر وہ بھی اپنی استعداد کے مطابق اور گناہ سے بچنے کی کوشش سب کرتے ہیں۔ اللہ کریم اِس میں اُن کی مدد بھی فرماتا ہے۔

تصوف میں ایک بہت بڑی آزمائش یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ اپنے اندر وہ استعداد پیدا نہیں کرتے یا یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ اپنی استعداد کو جو اللہ کریم نے بخشی ہے، بیدار نہیں کرتے اور شیخ کے انوارات میں اُن مقامات پر اپنی روح کو بھی دیکھتے ہیں۔ بالعموم ایسے لوگ پھر گمراہ ہوتے ہیں اور انھیں ٹھوکر لگتی ہے۔ اگر خلوص سے محنت کریں تو اللہ ایسے لوگوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ اَب ایک شخص سحری کے نوافل ادا کرتا ہے، اللہ کریم کا ذِکر کرتا ہے پھر مراقبات کرتا ہوا بارگاہِ رسالت پناہی ﷺ کی حاضری تک جاتا ہے، شام کو پھر یہ سب دہراتا ہے تو کیا اُسے احساس نہ ہوگا کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع پر تو وہ جان دے سکتا ہے۔ نیز حاضری اور بارگاہ کے انوارات و برکات روح کی تعمیر کا کام بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے خوش قسمت اور نصیب والے ہوتے ہیں۔

بدترین خلائق وہ ہوتے ہیں جو ان نعمتوں کو پا کر کھو دیتے ہیں اور اپنی شہرت یا دولت کے لالچ میں پڑ کر ان مقامات سے گر کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ اور خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ؕ (الحج:11) کا مصداق بن جاتے ہیں۔ یہ بارگاہ ایسی ہے کہ مجال دم زدن نہیں ہوتی۔ خاموش، باادب، سر جھکائے رُوح صرف درود شریف پڑھتی رہتی ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آئند جنید و بایزید اینجا

یہ بارگاہِ ادب ایسی ہے کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ قبرِ اطہر اور روضۂ مبارک کا آج بھی وہی ادب واحترام ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا۔ برزخ کی حاضری میں تو وہ کروڑوں گنا بڑھ جاتا ہے۔

ایک عجیب مشاہدہ و تجربہ فقیر کو ہوا۔ ایک بار جب حاضری نصیب ہوئی تو گرداگرد مسجدِ نبوی کی توسیع شروع تھی۔ اور ستونوں اور عمارت کی بنیادوں پر کام ہو رہا تھا۔ لوہے کے تقریباً ستر (۷۰) فٹ لمبے پائپ بڑی بڑی مشینوں سے ٹھوک ٹھوک کر زمین میں اُتارے جا رہے تھے۔ غالباً اُن پر ستون بنائے جانے تھے۔ وہ بہت سے تھے اور بہت بڑی بڑی مشینیں ہمہ وقت انھیں ٹھوکنے کا کام کر رہی تھیں اور کوئی بیس (۲۰) من کے قریب وزنی لوہے کا ایک بلاک وہ مشینیں اُٹھا اُٹھا کر اُن پر مار رہی تھیں۔ بے پناہ شور تھا۔ بڑے زور کی ٹھکا ٹھک ہر وقت جاری تھی۔ مسجدِ نبوی کے دروازے تک تو سارا شور آپ کے ساتھ رہتا مگر جیسے ہی دروازہ مبارک سے اندر مسجد میں داخل ہوتے تو ایک دم سکوت ہو جاتا۔ ہلکی سی آواز بھی مسجد شریف کے اندر سنائی نہ دیتی تھی۔ اور یہ ایک بار کا تجربہ نہیں۔ کئی دن قیام نصیب ہوا، دن میں کئی مرتبہ حاضری نصیب ہوتی اور ہر دفعہ یہی تجربہ ہوتا بلکہ اندر جا کر خیال تک نہ رہتا کہ باہر کوئی کام بھی ہو رہا ہے لیکن جونہی باہر آتے مشینوں کا شور بتا دیتا کہ کام ہو رہا ہے۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ۔

جہاں کے آداب کے اس طرح سے خیال رکھے جاتے ہیں کہ قدرت خود حفاظت فرماتی ہے وہاں بندے کو مجالِ دم زدن کیسی! لٰہذا وہاں سالکین کی ارواح بھی پورے سکون سے، سر جھکائے، برکات و انوارات جذب کرتی ہیں اور جتنی دیر بھی حاضری نصیب ہو یہی کیفیت ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ سب کرنے کے کام ہیں۔ انھیں کیا لکھا جائے اور کیا پڑھا جائے۔ ایک زمانہ تھا علماء اِن نعمتوں کی تلاش میں عمریں صرف کرتے اور ملکوں ملکوں پھرتے تھے۔ جہاں گوہر مراد ہاتھ آیا، جم گئے اور حاصل کر کے لوٹے۔ پھر یہ ذوق کم ہوتا گیا اور آج کل تو رواج اس نعمت کے انکار کا ہے۔ بلکہ اَب تو انکار سے آگے نکل کر لوگ تردید کرتے ہیں۔ اللہ کریم معاف فرمائے اور مسلمانوں کو پھر سے دلِ زندہ عطا کر دے کہ اصل قیمت یہی ہے جو اِس دارِ دنیا سے حاصل کر کے آخرت کا سرمایہ بنتی ہے۔

درحقیقت تصوف نام ہی کیفیاتِ قلبی کا ہے جو امورِ دنیا میں گہرے خلوص کی صورت ساتھ ہوتی ہیں۔ اور دنیا کے کام بھی اللہ کریم کے حکم کے مطابق اِس خلوص سے انجام پاتے ہیں کہ عبادات اور رکوع و سجود شمار ہوتے ہیں۔ جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دنیا کے سارے کام کیے۔ کھیتی باڑی، تجارت، جہاد، شادی بیاہ، اولاد، گھر مگر قرآن کریم فرماتا ہے:

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (الفتح:۲۹)

کہ اے مخاطب تو انھیں جب دیکھے گا، رکوع و سجود میں پائے گا یعنی زندگی کے تمام امور رکوع و سجود شمار ہوئے کہ ایک تو سب اللہ کریم کے حکم کے مطابق تھے اور

دوسرے ان میں خلوص بھی اس درجہ کا تھا جو اتباعِ سنت کے لیے مطلوب ہے۔

اِس سب محنت کا حاصل یہی ہے کہ اتباعِ سنت نصیب ہو اور پورے خلوص کے ساتھ نصیب ہو کہ اس پر آخرت کی دائمی اور ابدی زندگی کا مدار ہے۔ اگر اللہ کریم ان باتوں کا شعور عطا فرمائیں تو اِس دولت کا اندازہ ہوتا ہے اور اُن لوگوں کی عظمت کا احساس بھی ہوتا ہے جنھوں نے عمریں صرف کر کے یہ دولت حاصل کی اور پھر اُسے آگے پہنچایا۔ آج کا دور مادی مفادات کی زد میں ہے اور انسان مادہ پرستی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے۔ حتیٰ کہ اہل اللہ کی بات ہو تو خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ پہنچے ہوئے لوگ ہیں۔ اِن کی دُعا سے دنیا کا فائدہ مل جائے گا۔ ملازمت، روزگار، مال و دولت یا عہدہ و حکومت۔ یہ کوئی نہیں سوچتا یا شاید بہت کم لوگ سوچتے ہوں گے کہ یہ اللہ کا بندہ ہے اِس کے ساتھ رہنے سے آخرت سنور جائے گی۔ اور پھر فنا فی اللہ اور فنا فی الرسول ﷺ کا سوچنا تو دُور کی بات ہے۔ اللہ کرے عالمِ اسلام میں یہ احساس بیدار ہو اور پھر سے اِس چمن میں بہار آئے۔

جہاں تک اطاعت کے ظاہری اور عملی پہلو کا تعلق ہے۔ وہ اِس دورِ بے مایہ میں بھی بہت ہے۔ اذان ہو تو مساجد بھر جاتی ہیں۔ لوگ زکوٰۃ دیتے اور روزہ رکھتے ہیں حج و عمرہ پہ کمر بستہ رہتے ہیں۔ تبلیغ کا کام کرتے ہیں مگر جب بات معاملات پہ آتی ہے تو آدمی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ آخر کیوں؟ معاملات کیوں درست نہیں ہو پاتے؟ اِس لیے کہ معاشرہ برکاتِ نبوت اور دل کی روشنی سے محروم ہے۔ اعمال اور عبادات کی صورت تو ہے لیکن اس میں روح نہیں ہے کہ اعمال کو متاثر کر کے تابع سنت بنا دے۔

وہ روح یہی برکاتِ نبوت اور انواراتِ قلبی اور کیفیات ہیں، جو سلوک اور تصوف سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک بزرگ کے سامنے کسی نے بات کی کہ فلاں شخص ہوا میں اُڑ سکتا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ حرام کھانے والے اور مردار خور پرندے بھی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ یہ کون سا کمال ہے؟ کمالِ انسانی یہ ہے کہ سنتِ سُنّیہ کے سانچے میں ڈھل جائے اور اپنے کردار سے، اپنے آپ کو اللہ ﷻ کا بندہ اور حضور اکرم ﷺ کا غلام ثابت کرے۔ ہاں جو سکون اور تلذذِ قلبی اور وجود کے ہر ذرے میں ایک سرور پہنچتا ہے، وہ آزمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیان میں نہیں آسکتا۔ نیز ہر آدمی کی استعداد الگ اور اُس کے مطابق اس کے محسوسات الگ ہیں۔ لہٰذا کوئی ایک بندہ کیفیات کا اجتماعی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ہاں دُعا ہے کہ اللہ کریم تمام مسلمانوں کو اِس دولتِ بے بہا سے نوازے تو اس سے کیا بعید ہے۔

# مراقبۂ مسجدِ نبوی

فنافی الرسول ﷺ کا اگلا مراقبہ مسجدِ نبوی کا ہے کہ ارواح روضۂ اطہر سے باہر آکر مسجدِ نبوی میں حاضر ہوتی ہیں۔ جہاں خود سرورِ عالم ﷺ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کے بائیں جانب خلفائے راشدین علی الترتیب الخلافہ تشریف رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے آگے مشائخِ سلاسل عموماً اور اکثر صاحبِ منصب حضرات اور وہ بھی غوث یا اس سے اوپر کے مناصب کے حضرات کی کرسیاں ہوتی ہیں۔ جو ایک قوس سی بناتی ہیں۔ اس کے پیچھے بارگاہِ عالی میں حاضر ہونے والی ارواح مبارکہ کا ہجوم نہایت ادب اور خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر تشریف فرما ہوتا ہے۔ جن میں آنا جانا تو لگا رہتا ہے مگر اس خاموشی سے کہ مجلس میں احساس تک نہیں ہوتا۔ خلفائے راشدین کے عین پیچھے چار کرسیاں ہوتی ہیں جو اُن حضرات کے لیے مختص ہیں جو امت میں اللہ ﷻ کے چار سر بلند اور پسندیدہ بندے ہوں گے۔ وہ بھی اپنی اپنی مناسبت سے ترتیب وار وہاں تشریف رکھتے ہوں گے۔ آج تک، پہلی

کرسی پہ جن کا مقام تھا، جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ دوسری چھوڑ کر تیسری کرسی پر بھی ایک بزرگ تشریف فرما ہیں اور چوتھی کرسی پھر خالی ہے۔ حضرت استاذ نا المکرّم فرمایا کرتے تھے کہ چوتھی کرسی امام مہدی کی ہے۔ دنیا سے گزریں گے تو وہاں جلوہ افروز ہوں گے۔ یعنی دو کرسیاں ابھی خالی ہیں۔ دوسری اور چوتھی۔

یہاں جب شیخ حکم دیتا ہے کہ ''مراقبہ مسجد نبوی'' تو سالکین کی ارواح، جو بھی اس کے ساتھ ہوں، حاضر ہو جاتی ہیں۔ ان کی ایک طرف الگ جگہ ہے۔ مرد اپنی جگہ پہ صف بستہ کھڑے درود شریف پڑھ رہے ہوتے ہیں اور خواتین ایک الگ طرف۔ مگر ہر کوئی نگاہ نیچی کئے، سر جھکائے درود شریف پڑھ رہا ہوتا ہے اور اپنے قلب کو انوارات سے سیراب کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں بیعتِ روحانی کرائی جاتی ہے۔ ایک ایک سالک کو شیخ پیش ہونے کا حکم دیتا ہے تو اس کی روح حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش ہوتی ہے۔ جہاں حضور اکرم ﷺ ہاتھ مبارک بڑھاتے ہیں اور سالک اپنے دونوں ہاتھوں سے دستِ مبارک کو تھام لیتا ہے، بوسہ دیتا ہے اور دستِ اقدس کو پورے چہرے پہ پھیرتا ہے۔ ہاں بھئی ایسا ہی ہوتا ہے اور بالکل ہوتا ہے۔ شاید کسی کی نظر سے گزرے تو وہ سمجھے کیا بَڑ ہانک رہا ہے۔ مگر اللہ کریم شاہد ہے میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ کسی کے ماننے یا نہ ماننے سے مجھے کوئی غرض نہیں اور حق ہمیشہ ان باتوں سے بالاتر ہوا کرتا ہے۔ پھر سالک کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت کرائی جاتی ہے۔ وہ بھی اپنا دستِ مبارک بڑھاتے ہیں اور سالک دونوں ہاتھوں سے تھام کر بوسہ دیتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ حضرت علیؓ سے بیعت کی سعادت پاتا ہے۔ وہ اپنا ہاتھ مبارک

بڑھاتے ہیں۔ سالک دونوں ہاتھوں سے تھام کر بوسہ دیتا ہے۔ اور پھر بارگاہِ عالی کی طرف حاضر ہوتا ہے تو ہر ایک ضرور انعام سے نوازا جاتا ہے۔ کسی کو قرآن کریم، کسی کو تسبیح، کسی کو قلم، کسی کو جاءنماز، کسی کو جھنڈا اور کسی کو تلوار بارگاہِ پناہی سے عطا ہوتی ہے۔ غالباً جس مزاج کا بندہ ہو یا اللہ کریم اس سے جو کام لینا چاہیں اسی طرح کی چیز عطا ہوتی ہے اور یہ حق ہے کہ جب اللہ کریم کام لینا چاہتا ہے تو استعداد بھی عطا کر دیتا ہے اور توفیق بھی۔ ربِّ کریم کا نظام ایسا ہے کہ جب کسی سے کوئی کام لینا چاہے اُسے اُس کی استعداد بھی عطا کر دیتا ہے اور توفیق بھی۔ بندے کے ذمہ صرف ایک فیصلہ ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے یا خواہشات کا۔ پھر جن خوش نصیبوں کو صدیوں کے فاصلے سمیٹ کر بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچا دیتا ہے، اُن سا خوش قسمت کون ہوگا؟ (اگر انھیں احساس بھی ہو کہ یہ کتنی عجیب بات ہے) اکثر اوقات شیخ کی برکت سے بعض کو مراقبات و مقامات تو نصیب ہو جاتے ہیں مگر انھیں اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔

اسی طرح یہ نعمت خواتین کو بھی نصیب ہوتی ہے۔ ان کی جگہ الگ ایک طرف ہے۔ اگر کسی کو بیعت کی سعادت نصیب ہو تو اس کی رُوح کو بھی اُسی طرح بارگاہِ رسالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چادر مبارک کا گوشہ بڑھاتے ہیں جسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بوسہ دیا جاتا ہے اور آنکھوں سے لگائی جاتی ہے۔ پھر اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر واپس بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ خواتین کو بھی ضرور کچھ عطا ہوتا ہے۔ عموماً چادر، جاءنماز یا تسبیح

وغیرہ عطا ہوتی ہیں۔ مرد وخواتین میں کسی کو ایک چیز اور بعض کو متعدد اشیاء عطا ہوتی ہیں۔ جس کی روحانی بیعت ہوجاتی ہے وہ الٹے قدموں واپس اپنی جگہ پہ چلا جاتا ہے۔ نگاہ نیچی اور درود شریف جاری رہتا ہے۔

یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں (جتنا میں نے لکھ دیا ہے) بلکہ اس پر عمریں لگتیں ہیں اور وہ بھی تب کہ کامل شیخ کی صحبت نصیب ہو۔ ورنہ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں اور ایسی ہستی تک پہنچنا بھی محض اللہ کریم کا کرم ہوتا ہے۔ اول تو انسان کا اپنا فیصلہ ہے کہ وہ اِس میں کس درجہ کی طلب پیدا کرتا ہے۔ پھر تلاش اور پھر حصولِ منزل۔ میرے نزدیک پہلی ضروری اور اہم منزل شیخ کا ملنا ہے کہ اس سے آگے کا سفر شروع ہوتا ہے اور یہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

یہاں ایک بات کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ بارگاہِ رسالت پناہی ﷺ میں بیعت کے بعد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور پھر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت ہوتی ہے درمیان میں سیدنا عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیعت توصرف اویسیہ والوں کی ہوتی ہے۔ یہ واحد نسبت ہے جو براہِ راست سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جاری ہوتی ہے۔ باقی تمام سلاسل اور تمام نسبتیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شروع ہوتی ہیں۔ اِس لیے کہ برکاتِ نبوت جس طرح سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہوئیں اس میں وہ اکیلے ہیں، کوئی دوسری ہستی شریک نہیں۔ سفرِ ہجرت کو ہی دیکھ لیجیے کہ صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت ملی

تو انھیں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روکے رکھا اور پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت ملی تو عجب عالم میں۔ مشرکین مکہ کے تمام قبائل کے چنے ہوئے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر مبارک کو رات میں گھیرے میں لے لیا تو اللہ کریم نے ہجرت کی اجازت دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے بستر پہ سلایا اور خود ہجرت کے ارادے سے روانہ ہوئے اور مشرک دیکھ تک نہ سکے۔ تاریخِ اسلام پہ علامہ باذل ایرانی کی فارسی کی ایک منظوم کتاب ہے۔ علامہ باذل ایرانی شیعہ علماء میں سے ہے اور کتاب کا نام ''حملۂ حیدری'' ہے۔ وہ نظم کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لیے نکلے تو:

بوئے سرائے ابوبکر رفت ___ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکرؓ کے گھر کی طرف گئے۔ انھیں ساتھ لیا، اُن کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے زادِ راہ بھی دیا تو جبلِ ثور کی طرف جاتے ہوئے وہ منظر کشی کرتا ہے:

چوں رفتند چندیں ز دامانِ دشت

قدوم فلک سایہ مجروح گشت

ابوبکر آنگہ بدوشش گرفت

ولے این حدیث است جائے شگفت

کہ درکس چناں قوت آمد پدید

کہ بارِ نبوت تواند کشید

وہ لکھتا ہے ''جب کچھ دور ویرانے میں چلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم ہائے

مبارک زخمی ہو گئے تو اس وقت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے کندھوں پہ اُٹھالیا۔'' وہ کہتا ہے کہ ''یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ کسی آدمی میں اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نبوت کا بوجھ اُٹھا سکے۔''

تو میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ لمحہ بھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیب ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے دوش پہ سوار تھے اور کائناتِ ارضی سے رابطہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قدمین کا تھا۔ یعنی کائناتِ ارضی اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رابطہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

پھر غارِ ثور میں جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے:

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْهُمَا فِی الْغَارِ (التوبہ:۴۰)

یعنی دو میں کا دوسرا ہمراہ تھا غار میں۔ یعنی پورے عالم میں دو ہستیاں منفرد ہیں۔ انبیاء کرام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور غیر انبیاء میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اولیاء اللہ اور نیک بندوں کو اللہ جل جلالہ کی معیت نصیب ہوتی ہے مگر اس کا انحصار بندے کی صفات پہ ہوتا ہے۔ جیسے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرۃ:۱۵۳) اللہ جل جلالہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ تو معنی ہوا کہ اگر صبر کا دامن چھوٹ گیا تو معیتِ باری بھی نہ رہے گی۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو ہمہ وقت اور ہمیشہ معیتِ باری نصیب ہوتی ہے۔ اس کے چھوٹنے کا خطرہ نہیں ہوتا مگر معیت صفاتی ہوتی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (الشعراء:٦٢) رب صفاتی نام ہے۔ لیکن دنیا میں صرف دو ہستیاں ہیں جن کی ذواتِ مبارکہ کو معیتِ باری تعالیٰ نصیب ہے۔

ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (التوبۃ: ۴۰)

یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اِس میں نہ بندے کی طرف سے کوئی صفت ہے، نہ ذاتِ باری کی طرف سے بلکہ ذاتِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ذاتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ کی معیتِ ذاتی نصیب ہے۔ صرف یہ دو ذوات پوری انسانیت میں ہیں، ایک انبیاء کرامؑ میں سے اور وہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرے غیر انبیاء میں سے، وہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ لہٰذا جس قدر فیوضات و برکات بارگاہِ رسالت سے تقسیم ہوتی ہیں، اُمت اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں اور نسبتِ اویسیہ اُنھیں سے چلتی ہے۔ لہٰذا اُن کی بیعت کی جاتی ہے۔ ان کے بعد تمام برکات حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیب ہوئیں، اُن کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور اُن سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو، لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہ آکر تقسیم ہونے لگ گئیں۔ پھر کوئی ایسی ہستی نہ ہوئی جو جمیع برکات کی حامل ہوتی۔ بلکہ مختلف ہستیوں کو مختلف انداز سے برکات نصیب ہوئیں۔ اُن کے مقابلے کی جامع الصفات ہستی نہ ہوئی۔ لہٰذا تمام سلاسلِ تصوف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتے ہیں، سوائے نسبتِ اویسیہ کے۔ لہٰذا سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرائی جاتی ہے۔ بارگاہِ رسالت میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے رجسٹر رکھا ہوتا ہے۔ جس میں تمام

اولیائے اُمت کی تفصیل ہوتی ہے۔ یہی بارگاہ ہے جس سے بڑے بڑے امور متعلق ہیں۔ اور فیصلے ہوتے ہیں۔ عجیب عالم ہوتا ہے۔ متعلقہ ہستیاں حاضر ہوتی ہیں۔ مشاورت کی اجازت بلکہ مشاورت طلب کی جاتی ہے اور پھر فیصلہ صدرِ مجلس یعنی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ باتیں بتائی جائیں لیکن ہوتا ایسا ہے کہ عموماً غوث اور اس سے اوپر کے حضرات سے مشاورت ہوتی ہے۔ اکثر وہ حضرات جوان مناصب پہ دنیا سے گزر چکے، وہ بھی جلوہ افروز ہوتے ہیں اور مشاورت میں انھیں شامل فرمایا جاتا ہے۔ فقیر ایک بات بطورِ نمونہ عرض کیے دیتا ہے کہ حکمران معزول ہو کر جیل میں تھا اور اُس کے ذمہ قتل لگا تھا۔ اس کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا۔ فقیر اُن دنوں مردان میں تھا اور حضرت رحمتہ اللہ علیہ قیام فرما تھے۔ رات کے ذکر کے بعد سو گئے کہ فقیر نے دیکھا دربار لگا ہوا ہے اور اس معزول حکمران کے بارے مشاورت فرمائی جا رہی ہے۔ فقیر بھی دست بستہ ایک طرف کھڑا ہے۔ مختلف ہستیوں نے مشورے عرض کیے جن سب کا ماحصل یہ تھا کہ اس سے اقتدار لے لیا گیا ہے۔ آئندہ اِسے اقتدار سے محروم کر دیا جائے اور چھوڑ دیا جائے۔ خود اپنا کیا بھگتے گا۔ آخر فقیر کو عرض کرنے کا اشارہ ہوا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ حضرات تو دارِ دنیا سے گزر چکے ہیں مگر ہم یہ حالات بھگت رہے ہیں اور یہ شخص ایسا ہے کہ اس کا ایک مافوق الفطرت تصور بن رہا ہے اور یہ دین کے خلاف اپنے اِزم (ism) کا علمبردار ہے۔ اِسے پھانسی دی جائے اور عام جلاد عام مجرموں کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پھانسی دے تاکہ پتہ چلے کہ یہ بھی ایک عام آدمی تھا، کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں۔ بات ختم ہوگئی۔ صبح نماز

اور ذکر کے بعد جب حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ تشریف فرما ہوئے تو خواب عرض کیا۔ فرمایا ''خواب نہیں یہ مشاہدہ تھا، بہرحال اب اگر دوبارہ بھی کبھی طلبی ہو تو اس مشورہ پر قائم رہنا۔ آگے فیصلہ تو جو حضور اکرم ﷺ کی منشا ہوگی وہی اللہ کریم کو منظور ہوگا۔'' اس کے بعد کافی دیر مقدمہ چلتا رہا۔ دنیا بھر کی حکومتوں نے مداخلت کی مگر عمل اُسی فیصلے پر ہوا اور اُس شخص کو اُسی طرح پھانسی پہ لٹکایا گیا۔ یہ سب عجیب امور اور حیرت زدہ کر دینے والی باتیں ہیں مگر کوئی چاہے تو یہ کر کے دیکھے۔

اُس دربار کے حاضر لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں بلکہ فنافی الرسول بندے کی موت بھی اکثر ایسے ہوتی ہے کہ روح بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتی ہے اور ملک الموت صرف بدن سے روح کا، دُنیا کی زندگی کا تعلق ختم کر دیتا ہے۔ سبحان اللہ! کیسے عجیب لوگ ہیں اور اِسی عالم میں ہمارے ساتھ گزر کرتے ہیں مگر کتنے خوش قسمت ہیں کہ کیسی کیسی نعمتوں سے سرفراز ہوتے ہیں۔

حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کا واقعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بندہ پہلے لکھ چکا ہے کہ جس شام حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کا وصال ہوا، آپ اسلام آباد تھے۔ بندہ وہاں سے واپس آیا تھا اور صبح پھر جانے کا ارادہ تھا کہ شام کے وقت بندہ پر استغراق وارد ہوگیا۔ یہ ایک کیفیت ہے، جس میں بندہ بات سن رہا ہوتا ہے مگر حرکت ختم ہو جاتی ہے اور لگتا ہے بے سدھ پڑا ہے۔ بندہ چارپائی پہ بیٹھا تھا کہ لیٹ گیا۔ دیکھا بارگاہِ رسالت ہے اور خاص چہل پہل ہے۔ کوئی خاص بات ہے۔ پھر دیکھا حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ حاضر ہوئے ہیں۔ آپ کی بہت عزت کی جارہی ہے۔ خصوصی

لباس عطا ہوا ہے اور بارگاہِ رسالت میں آپ کی حاضری ہو رہی ہے اور بڑی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ اتنے میں ایک بندہ اطلاع کرنے ہمارے غریب خانے پہ بھاگتا ہوا آیا اور گھر والوں کو حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ کے وصال کی خبر سنانے لگا۔ فقیر اس کی بات سن رہا تھا اور اہلِ خانہ کی باتیں بھی مگر خود روحانی طور پر بارگاہِ عالی میں تھا۔ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ جب وہ سب کیفیت ختم ہوئی تو بندہ اُٹھا اور اسلام آباد روانہ ہو گیا۔

یہ عجیب واقعات اُن لوگوں کے ہیں جن پر اللہ کریم کے یہ انعامات ہیں۔ یہاں (اِس مراقبہ میں) بھی ایک مراقبہ فنا درفنا کرایا جاتا ہے۔ مگر اس بارے لکھنے کا فائدہ نہیں۔ جب وہ عام طور پر نہیں کرایا جاتا۔ چند چُنے ہوئے لوگوں کو کرایا جاتا ہے۔ اِسی طرح جمادات، نباتات سے بات کرنے اور اُن کی سننے کا مراقبہ بھی ہے مگر بہت کم لوگوں کو کرایا جاتا ہے۔ یہ ہر کسی کے لیے نہیں ہوتا۔ ہاں یہ سب کمالات و مقامات اور مراقبات فنا، بقا تک کے ہیں جسے اکثر حضرات نے سلوک کی انتہا لکھ دیا ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ ابتدا ہے اور سلوک کی ابجد ہے۔ جسے یہ سب نعمتیں حاصل ہو جائیں اسے آگے سلوک و تصوف کی راہ پر چلایا جاتا ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس کی انتہا نہیں ہے۔ اَب یہ اللہ کریم کی مرضی ہے کہ کس کو کہاں تک لے جاتا ہے اور کیا مقام و مرتبہ عطا کرتا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العلمین

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقه محمدٍ وآله وصحبه اجمعین

○○○